
منزل دور ہے

(۱)

ساون کی رُت تھی۔

آسمان پہ گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ زوروں کی بارش ہو رہی تھی۔ ہر طرف، ہر سمت پانی ہی پانی تھا۔ نیلے اور سُرخ رنگ کی ایک بس ایک برساتی نالے کے کنارے آکر رُکی۔ سواریاں اُتر کر نالہ پار کرنے لگیں۔ اس کے بعد خالی بس بھی اس میں سے گزر گئی۔

نالے کے اس پار سواریاں پھر اس بس میں بیٹھ گئیں اور نیم پختہ سی سڑک پر بس پھر پانی اور کیچڑ اچھالتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ کوئی پندرہ منٹ چلنے کے بعد بس پھر رُکی اور دو سواریاں اس میں سے اُتریں۔ ایک تو بھرے بھرے جسم، مضبوط اعضاء اور لمبے قد کا ایک جوان تھا اور اس کے ہاتھ میں

چمڑے کا ایک تھیلا تھا۔ جس میں شاید اس کے کپڑے تھے۔

دوسرا ایک اُدھیڑ عمر کا مرد تھا۔ بس اُنہیں اُتار کر آگے نکل گئی اور نزدیک ہی آگے اڈے پر جا کر کھڑی ہو گئی جو وہاں سے کوئی سو گز کے فاصلے پر تھا۔ نوجوان جب ایک طرف بڑھنے لگا تو اس بوڑھے نے پوچھا۔

مَیں نے کچاں والی جانا ہے، کِدھر کو جاؤں؟

نوجوان نے ہاتھ سے اپنے سامنے نزدیک ہی ایک گاؤں کی طرف اشارہ کر دیا۔

بوڑھا پھر بولا۔

یہ دوسرے گاؤں کون کون سے ہیں؟

اس نے پھر جواب دیا۔

یہ تو سگر ہے اور اس سے آگے بس نہیں جاتی۔ دائیں طرف جو تین گاؤں دکھائی دے رہے ہیں یہ جون پور۔ خود لتھی اور چمرا ہیں اور یہ بائیں طرف بدر۔ چاندی کوٹ۔ مچھرالہ۔ جلانی اور آدم پور ہیں اور سگر کے اس طرف جوگی کوٹ، کچاں والی اور مرالہ ہیں۔

تم کہاں جاؤ گے؟

مَیں نے سگر ہی میں جانا ہے۔

تو پھر یہاں کیوں اُترے ہو اڈے پر اُتر جاتے۔

وہاں اس وقت پانی کھڑا ہو گا۔ اس لیے مَیں نے سوچا کہ یہیں اُتر جاؤں۔ بس والے یہاں بس روکتے تو نہیں پر وہ میرے جاننے والے ہیں۔

اس لیے روک دی ہے۔

مَیں تو تمہیں دیکھ کر یہاں اُتر گیا تھا۔ اب مَیں یہاں سے ہی سگر کے باہر باہر نکل جاؤں یا اڈے سے کوئی راستہ جاتا ہے۔

اڈے ہی چلے جاؤ وہاں سے ایک کچی سڑک کچاں والا کی طرف جاتی ہے جو آگے جا کر دریا کے کنارے کنارے پہاڑ کی جانب نکل گئی ہے۔

دریائے چناب یہاں سے کتنی دور ہے؟

بس ایک میل۔

اور کچاں والا؟

آدھا میل۔ تم شاید پہلے کبھی اِدھر نہیں آئے۔

ہاں، پہلی بار ہی آیا ہوں۔

کس کے ہاں جاؤ گے؟

جاؤں گا تو کسی کے ہاں نہیں۔ تمباکو کا بیوپار کرتا ہوں، وہاں سے تمباکو خریدوں گا۔ اس گاؤں کا تمباکو اچھا ہوتا ہے۔

بوڑھا اڈے کی طرف بڑھ گیا۔

وہ نوجوان ایک کچے راستے سے جس پر پانی کھڑا ہوا تھا گاؤں کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کی پتلون اور قمیض بُری طرح بھیگی ہوئی تھی اور بوٹوں پر خوب کیچڑ لگی ہوئی تھی۔

گاؤں سے باہر ہی وہ ایک حویلی کے سامنے رُک گیا۔ وہاں شاید کوئی آٹا پیسنے کی مشین۔ کیونکہ چھت پر دھواں نکلنے کا لوہے کا سلنڈر تھا اور اس

کے اوپر آواز پیدا کرنے والی ٹوپی بھی تھی۔ باہر ایک نلکا تھا اور اس کے پاس ہی انجن سے گرم پانی نکالنے کا لوہے کا پائپ بھی تھا۔

حویلی کے ایک کمرے کے باہر دیوار کے ساتھ سرخ رنگ کا ایک لیٹر بکس لگا تھا جس پر پیتل کا تالا پڑا تھا۔ شاید وہاں مشین کے علاوہ ڈاکخانہ بھی تھا۔ اس نے ایک دروازے پر دستک دی۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا۔ سامنے چالیس برس کے سن کا ایک مرد کھڑا تھا۔ نوجوان کو دیکھتے ہی اس نے اسے گلے لگا لیا اور مسکراتے ہوئے پوچھا۔

ابھی آئے ہو۔

جی ہاں۔

جہاں وہ دونوں کھڑے تھے وہ دکان تھی اور اس کے اندر ہی سے ایک دروازہ دوسرے کمرے کی طرف جاتا تھا جو خاصہ بڑا تھا اور اس میں آٹا پیسنے کی مشین لگی ہوئی تھی۔ وہ دونوں کھاٹ پر بیٹھے ہی تھے کہ مشین والے کمرے سے کسی نے پوچھا۔

کون آیا ہے ابا جی!

اس نے پھر مسکرا کر کہا۔

اِدھر آ کر دیکھو تو کون آیا ہے۔

تھوڑی دیر بعد دس بارہ برس کا ایک بچہ اندر آیا اور بھاگ کر اس نوجوان سے لپٹ گیا۔

او! سلیم بھیا آ گئے۔

اتنے میں باہر سے کسی نے آواز دی۔

منشی امین جی! اے منشی جی!

وہ مرد جس نے دروازہ کھولا تھا اُٹھ کر باہر آیا۔ دروازے کے پاس ہی گاؤں کے ہائی سکول کا ہیڈ ماسٹر حنیف کھڑا تھا۔ منشی امین نے بڑی انکساری سے کہا۔

ماسٹر جی! آپ یوں باہر کھڑے کیوں ہیں۔ اندر آ جائیں نا۔ باہر تو ابھی تک بارش ہو رہی ہے۔

حنیف نے اندر آتے ہوئے کہا۔

میں نے سمجھا اندر تمہارے بیوی بچے ہیں اس لیے میں باہر کھڑا ہو گیا تھا۔ اتنے میں اس کی نظر سلیم پر پڑ گئی اور وہ اس سے مخاطب ہوا۔

کب آئے ہو سلیم!

سلیم نے اس سے مصافحہ کیا۔

بس ابھی آیا ہوں جی۔

کیا بنا اس انٹرویو کا جس کے لیے گئے ہوئے تھے۔ کوئی نوکری ملی۔

سلیم مایوس ہو گیا۔

کہاں ماسٹر جی! ہم جیسوں کو کون پوچھتا ہے۔

حنیف نے تاسف سے کہا۔

عجیب دور آ گیا ہے تعلیم کی تو قدر ہی نہیں رہی۔ آج کل تو بچوں کو آرٹ پڑھانا ہی بے کار اور فضول ہے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ بچے کو شروع

ہی سے کسی ٹیکنیکل کام میں لگا دیا جائے۔ اس کے علاوہ ہمارا نظامِ تعلیم کچھ معیاری نہیں اور ہماری زندگی کے موجودہ تقاضوں پر پورا نہیں اُترتا۔ میرے خیال میں تو یہ منشی امین سب سے اچھا ہے۔ دس پاس ہے۔ ڈاکخانے کا پوسٹماسٹر بھی ہے دکان بھی چلا رہا ہے اور آٹے کی مشین ایک ہی وقت میں ہر کوئی اتنے کام نہیں کر سکتا۔ پتہ نہیں یہ منشی جی کیسے ان تینوں کاموں سے نمٹ لیتے ہیں۔

اس نے بڑی عاجزی سے کہا۔

بس ماسٹر جی! اللہ کا احسان ہے۔ صبح سویرے اُٹھتا ہوں اور ڈاک تیار کر کے بھجوا دیتا ہوں اور دکان کھول کر بیٹھ جاتا ہوں۔ پھر شہر سے ڈاک آجاتی ہے اور یہ میرا چھوٹا لڑکا طارق بھی سکول سے آجاتا ہے۔ اس کو دکان پر بٹھا دیتا ہوں۔ یہ یہاں بیٹھ کر پڑھتا بھی رہتا ہے اور گاہکوں کو سودا بھی دیتا ہے۔

اس دوران میں خود انجن چلا لیتا ہوں۔ ارد گرد کے سب گاؤں میں یہی ایک مشین ہے اور سب لوگ آٹے کے لیے یہیں آتے ہیں۔ میں انہیں ان کے گاؤں کی ڈاک بھی دے دیتا ہوں اور اس طرح یہ خود بخود ہی بٹ جاتی ہے۔ باقی رہ گئے منی آرڈر تو میں ان ہی لوگوں کے ہاتھوں جس کا منی آرڈر ہوتا ہے اسے پیغام بھجوا دیتا ہوں اور وہ یہاں سے آ کر لے جاتا ہے۔ بس اس طرح اپنا دھندا چل ہی رہا ہے۔

سلیم مسکرا دیا۔

ہر کوئی منشی امین تو نہیں ہو سکتا نا جی!

حنیف نے اس بار سلیم سے پوچھا۔

اب کیا ارادہ ہے برخوردار! کیا کرو گے؟

سلیم نے اپنی مایوسی کو چھپاتے ہوئے کہا۔

سروس کے لیے تو بہت دھکے کھائے ہیں ماسٹر جی۔ بی اے کیا تھا کہ شاید کہیں اچھی سروس مل جائے گی مگر نا امیدی ہی ہوئی۔ اب بھائی کے ساتھ اپنا کھیتی باڑی کا کام ہی کروں گا۔ گھر والوں کو کچھ تو میرا فائدہ ہوگا۔ میری ماں نے تو جو کچھ جمع کیا تھا سب ہی مجھ پر خرچ کر دیا اور حاصل کچھ بھی نہ ہُوا۔

بہت ہی اچھا ارادہ ہے۔ پڑھے لکھے جوان پتہ نہیں کیوں کھیتی باڑی سے جی چراتے ہیں۔ اگر وہ اس میدان میں آئیں تو ان پڑھ لوگوں کی نسبت وہ پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ کر سکتے ہیں۔

سلیم نے اپنا چمڑے کا تھیلا اُٹھایا اور باہر نکلنے لگا۔

اچھا منشی جی! میں چلا، اب پچھلے پہر ہی آؤں گا۔

سلیم چلا گیا تو امین نے حنیف سے کہا۔

بیٹھیں نا ماسٹر جی!

نہیں چلتا ہوں۔ دو لفافے دے دو۔ اس نے جیب سے پیسے نکالتے ہوئے کہا۔

امین نے حنیف کو لوہے کی صندوقچی سے لفافے نکال کر دیئے اور وہ چلا گیا۔

سلیم گاؤں میں آیا اور دو تین گلیوں کے موڑ مڑتا ہوا ایک پکّی حویلی میں داخل ہوا صحن میں بارش کے باعث کیچڑ ہو گیا تھا اور اس میں سے گزرنے کے لیے اینٹیں رکھ دی گئی ہوئی تھیں ۔

سامنے برآمدے میں اس کا دادا غفور بیٹھا تھا اور ذرا دائیں طرف اس کی ماں گلشن آٹا چھان رہی تھی ۔ صحن کا ایک حصہ اینٹیں لگا کر پکا کر دیا گیا ہوا تھا اور اس پر دو بھینسیں، دو بیل اور ایک گھوڑی بندھی ہوئی تھی ۔ اور اس کی بھابی کشور نل سے پانی نکال نکال کر انہیں بالٹی میں پلا رہی تھی ۔

اینٹوں پر سے ہوتا ہوا جب وہ برآمدے میں آیا تو بوڑھے غفور نے اٹھ کر اسے گلے لگایا۔ سلیم نے جھک کر بچوں کی طرح دادا کی چھاتی پر سر رکھ دیا ۔

کیسے ہو باپو !

غفور نے اس کا گال تھپتھپایا۔ ٹھیک ہوں بیٹے !

گلشن بھی اٹھی۔ آٹے والے ہاتھ جھاڑتی ہوئی آگے بڑھی اور سلیم کو گلے لگا کر اس کی پیشانی چوم لی ۔ کشور بھی وہاں آ کھڑی ہوئی ۔ کیچڑ سے بچنے کے لیے اس نے اپنی شلوار کے پائنچے اوپر اٹھا رکھے تھے وہ اٹھارہ برس کے سن کی ایک حسین اور پُرکشش لڑکی تھی ۔ اس کی بے پناہ خوبصورتی اور پُرکشش جسم کا تناسب ایسے ہی تھا جیسے ——— جیسے

پربت اور بدریا کا حسین سنگم ۔

ڈوری اور پتنگ کا خوب صورت ملاپ ——— اور

اور ہاتھ اور مہندی کا قابلِ رشک جوڑ ۔ وہ ——— وہ سلیم کے

بڑے بھائی نصیر کی بیوی تھی ۔

اتنے میں کشور کا چھوٹا بھائی جس کی عمر بمشکل نو برس کے قریب ہو گی بھاگتا ہوا ایک کمرے سے نکلا اور سلیم کی ٹانگوں سے لپٹ گیا ۔

سلیم اسے اٹھا کر پیار کرنے لگا ۔

کیسے ہو سجاد !

وہ سلیم کی گردن سے لپٹ گیا ۔

ٹھیک ہوں بھیّا !

سکول نہیں گئے ۔

آج تو بارش ہے نا بھیّا ۔ سکول میں چھٹی ہے ۔

اتنے میں کشور بھی سامنے آ کھڑی ہوئی ۔ سلیم نے سجاد کو اٹھائے ہی اٹھائے پوچھا ۔

کیسی ہو بھابی !

کشور پاؤں جھاڑتی ہوئی برآمدے میں آ گئی ۔

ٹھیک ہوں ——— نوکری ملی ۔

سلیم مایوس ہو گیا ۔

اوں ہوں ۔

کشور بھی کچھ دلگیر سی ہو گئی ۔

غفور نے بول کر اس ماحول کو فوراً ختم کر دیا ۔

نہیں ملی تو جہنم میں جائے ۔ تمہارے چار بڑے بھائی ہیں کمانے والے

تم کیوں فکر کرتے ہو۔ چُپ کر کے گھر بیٹھے رہو، کوئی ضرورت نہیں ہے دھکے کھانے کی۔

پھر وہ کشور سے مخاطب ہُوا۔

کشور!

جی باپو!

چلم ہی بھر دو بیٹی!

سلیم نے سجاد کو نیچے اُتارتے ہوئے کہا۔

تم رہنے دو بھابی! میں خود بھرے دیتا ہوں۔

گلشن بھی کھڑی ہو گئی۔

میں حقہ بھر دیتی ہوں کشور! تم سلیم کو کپڑے نکال کر دو۔ اس کی پتلون قمیص دیکھو کیسے بھیگ رہی ہیں۔

گلشن حقہ بھرنے لگی۔ کشور اندر سے کپڑے لے آئی اور سلیم کو تھما دیے۔

چلو بدلو کپڑے!

سلیم نے چُپ چاپ کپڑے بدل لیے۔ بوٹ اُتار کر اس نے سلیپر پہن لی۔ کشور اس کے بُوٹ اُٹھا کر باہر لے جانے لگی۔

پڑے رہنے دو بھابی! میں صاف کر دیتا ہوں۔

نہیں، میں دھو دیتی ہوں۔ وہ نل کی طرف بڑھی۔

سلیم نے اُٹھ کر بُوٹ پکڑ لیے۔

کیوں گناہ گار کرتی ہو بھابی!

کشور نے بڑے پیار سے کہا۔

"چھوڑ دو نا میں دھو دیتی ہوں"

سلیم نہ مانا۔

"اوں ہوں۔ یہ میرا کام ہے۔"

غفور بھی بولا۔

دھونے دو سلیم۔

یہ کام میرا ہے باپو!

ضد نہ کیا کرو بیٹا!

سلیم نے بُوٹ چھوڑ دیے اور کشور نل پر آئی۔ خوب اچھی طرح بوٹ صاف کر کے اس نے برآمدے میں ایک طرف رکھ دیے۔

گلشن چلم بھرنے کے بعد پھر آٹا چھاننے لگی۔ سلیم نے اس سے پوچھا۔

"بھیا کہاں ہیں ماں!

گلشن نے چھلنی جھاڑتے ہوئے کہا۔

"چارہ لینے گیا ہے بیٹے!"

"کس وقت گیا ہے؟"

"بس تمہارے آنے سے تھوڑی ہی دیر پہلے۔"

سلیم کھڑا ہو گیا۔

"میں بھی جاتا ہوں پھر۔"

"کھانا تو کھا لو نا۔" کشور نے اسے ٹوکا۔

گلشن اور غفور بھی ایک ساتھ بول پڑے۔

"ہاں بیٹے! کھانا کھالو۔

سلیم صحن میں آگیا۔

"واپس آکر کھاؤں گا۔"

کشور اس کی پتلون اور قمیض اٹھا کر بھی نل پر لے آئی۔ سلیم نے پھر اس سے پوچھا۔ "کیا کرنے لگی ہو بھابی!"

بڑے بھولے پن سے اس نے جواب دیا۔

"دھولوں نا انہیں۔"

"تم شاید آرام سے بیٹھ نہیں سکتی ہو۔"

"ابھی دھو دیتی ہوں پھر یہ آئے گی۔"

"ان کی پھر جیبیں بھی دیکھ لینا ان میں پیسے ہوں گے۔

کشور اس کے کپڑوں کی جیبیں ٹٹولنے لگی اور وہ چپل اس کے پاس ہی اتار کر ننگے پاؤں باہر نکل گیا۔



(۲)

گاؤں سے نکل کر وہ اس کچی سڑک پر چلا جا رہا تھا جو سیدھی دریائے چناب کی طرف جاتی تھی اور پھر دریا کے کنارے کنارے پہاڑ کی جانب چلی گئی تھی۔ جہاں سے دریا کے کنارے شیشم، کیکر، کائی اور سرکنڈے کا جنگل شروع ہوتا تھا۔ اس سے قریب ہی وہ بائیں طرف ایک پتلی سی پگ ڈنڈی پر مڑ گیا۔

وہ تھوڑی ہی دور آگے گیا ہوگا کہ اچانک اس کی نظر سامنے اٹھ گئی جنگل کے بالکل کنارے تربوز اور خربوزے کے کھیت میں جس کے اندر ہرا ہرا باجرہ بھی کافی کھڑا تھا۔ دو آدمی آپس میں گتھم گتھا لڑ رہے تھے۔ یہ اُن کا اپنا کھیت تھا۔ اس نے غور سے دیکھا لڑنے والوں میں ایک اس کا بڑا بھائی نصیر اور دوسرا گاؤں کے چوہدری اور جاگیردار کا لڑکا اختر تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو بُری طرح مار

رہے تھے ۔

اتنے میں اس نے دیکھا کہ جنگل کی طرف سے ایک بوڑھا آدمی جو چوہدری حاکم کا ملازم تھا زور زور سے چلاتا آرہا تھا ۔

”مار دو ۔

جان سے مار ڈالو اس کو ۔ روز ہم سے یہ جھگڑا کرتا ہے ۔“

مگر اس نے جب دیکھا کہ سلیم بھی بھاگتا ہوا ادھر ہی آرہا ہے تو وہ سرکنڈوں کے جھنڈ میں دبک کر خاموش ہو گیا ۔ سلیم جب موقع پر پہنچا تو اس کے بھائی نصیر نے چوہدری کے لڑکے اختر کو نیچے گرا رکھا تھا اور اپنے گھٹنے اس کے پیٹ پر رکھے ہوئے وہ اس پر سوار تھا ۔

سلیم نے نصیر کو شانے سے پکڑ کر پیچھے ہٹایا اور اچنبھا پوچھا ۔

”یہ کیا بھیا ! کیوں لڑ رہے ہو آپس میں ؟“

نصیر نے اختر کی طرف اشارہ کیا ۔

”اس ذلیل سے پوچھو ۔“

”کیوں ؟ کیسے جھگڑا ہوا اختر ؟“ سلیم نے اب اس سے پوچھا ۔

مگر اختر کوئی جواب نہ دے سکا ۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا ۔

سلیم نے پھر اپنے بھائی سے پوچھا ۔

”بتاؤ نا بھیا ! کیوں جھگڑا ہوا ؟“

نصیر نے غصے سے دانت کچکچائے ۔

”روز ہمارے کھیت میں مویشی چھوڑ دیتے ہیں ۔ دیکھو ! بیلے میں مویشی

چرانا منع ہیں مگر ان کے چر رہے ہیں ۔ گارڈ بھی ان کو کچھ نہیں کہتا ۔ سالا کہیں نظر آئے تو بات کروں اس سے کہ کیوں حرام کی تنخواہ لیتا ہے ۔“

”پر آج یہ جھگڑا کیسے ہوا ؟“

”میں جب یہاں آیا تو ان کے دونوں گھوڑے ہمارا باجرہ کھا رہے تھے اور یہ ذلیل پاس بیٹھے دیکھ رہے تھے ۔ میں نے جب منع کیا تو ان کا نوکر تو بھاگ گیا مگر یہ الجھ پڑا اور جھگڑا ہو گیا ۔“

سلیم نے اختر کو پیچھے ہٹایا ۔

”جاؤ میرے بھائی ! جا کر اپنا کام کرو ۔“

اختر چلا گیا ۔

سلیم نے پھر نصیر سے کہا ۔

”جھگڑا اچھی چیز نہیں بھیا ! تم اسے آرام سے سمجھاتے تو آئندہ ایسا نہ کرتے ۔“

”یہ پیار اور آرام نہیں مانتے ۔“

”پھر بھی امن و آشتی بڑی اچھی چیز ہے ۔ لڑائی جھگڑوں میں کیا رکھا ہے ۔ انسان خواہ مخواہ ہی کچہری اور عدالتوں میں چکر میں پڑ جاتا ہے ۔ ہم غریب لوگ تو عدالت میں پہنچنے تک کے اخراجات بھی برداشت نہیں کر سکتے ۔“

نصیر نے نیچے پڑی ہوئی اپنی درانتی اٹھا لی ۔

”چھوڑو ان باتوں کو ، کس وقت آئے ہو ؟“

”ابھی ابھی آیا ہوں اور کپڑے بدل کر ادھر ہی آگیا ہوں ۔“

”تم نے آرام کیا ہوتا ۔ کیا ضرورت تھی آنے کی اور ہاں نوکری ملی ؟“

سلیم پھر دل برداشتہ سا ہو گیا۔

"کوئی نہیں ملی۔"

نصیر نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔

"اداس کیوں ہو گئے ہو۔ نہیں ملی تو کیا ہوا ! تم چار بھائیوں کے چھ بھائی ہو۔ جب تک ہم زندہ ہیں تمہیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم میں چارہ کاٹ لوں۔"

"میں بھی کاٹوں گا بھیا ! آج سے میں آپ کے ساتھ کھیتی باڑی کا کام کیا کروں گا۔ اب میں نوکری کے چکر میں نہیں پڑوں گا۔"

"درانتی لائے ہو۔"

"وہ تو نہیں لایا۔"

"تو پھر تم بیلیں جڑ سے اکھاڑو اور میں باجرہ کاٹ لیتا ہوں۔ صرف کی بیلیں اکھاڑنا۔ تربوز کی نہیں۔ ان کے ساتھ ابھی کافی پھل ہے۔ تمہارے نے بہت تربوز کھائے ہیں۔"

"تو بیلیں کیا کرو گے؟"

"وہ اپنی بڑی بھینس کھالیتی ہے۔ اسی طرح اس کے آگے ڈال گے۔ ان سے ہی پیٹ بھر لے گی۔"

سلیم بیلیں اکھاڑ اکھاڑ کر ڈھیر کرنے لگا اور نصیر بڑی تیزی سے کاٹنے لگا۔ بیلوں کا اچھا خاصا ڈھیر لگانے کے بعد سلیم نے نصیر سے پوچھا۔

"ذرا دیکھو بھیا ! کافی ہیں یا اور اکھیڑوں۔"

نصیر نے مڑ کر دیکھا۔

"بس کرو کافی ہیں۔"

سلیم کھیت میں گھومنے لگا۔ اچھی طرح دیکھ اور پرکھ کر اس نے چار تربوز توڑے اور بیلوں کے ڈھیر کے پاس ہی لا رکھے پھر ایک تربوز اس نے مکہ مار کر توڑا اور پھر دونوں ہتھیلیوں میں دبا کر اس کے اندر دیکھا اور زور سے چلایا۔

"اے بھیا ! لال سرخ تربوز۔"

وہ نصیر کے پاس آیا اور تربوز کے دو ٹکڑے کر کے اس کے سامنے رکھ دیئے۔ "لو کھاؤ۔"

نصیر اس کی بچوں جیسی حرکتیں دیکھ کر مسکرا دیا۔

"تم کھاؤ۔ ہم تو روز ہی کھاتے ہیں۔"

"کھاؤ نا بھیا !"

نصیر نے درانتی ایک طرف رکھ دی اور دونوں تربوز کھانے لگے۔ سرخ سرخ گری ختم ہونے پر جب پانی رہ گیا تو سلیم نے پھر بڑے بھولے پن سے پوچھا۔

"یہ پانی پی جاؤں بھیا ! لوگ کہتے ہیں اچھا ہوتا ہے۔"

نصیر پھر ہنس دیا۔

"پی لو۔"

سلیم نے تربوز منہ سے لگا کر پانی پی لیا۔

نصیر نے اپنا کٹورا بھی اس کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ بھی پی لو۔"

"تم بھی پیو نا۔"

"اُوں ہوں، تم پی لو۔"

سلیم وہ بھی پی گیا۔

دونوں بھائیوں نے مل کر باجرہ اور بیلیں اکٹھی باندھ لیں۔ سلیم اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"گدھی نہیں لائے ہو بھیا!"

"نہیں کیچڑ اور بارش ہے ایسے میں اس جانور کو نہیں لادنا چاہیے۔ تم اُٹھاؤ اور میرے سر پہ رکھوا دو۔"

نصیر نے سر پہ چادر لپیٹتے ہوئے کہا۔

سلیم نے اس کے سر سے چادر اُتاری۔

"نہیں، میں اُٹھاؤں گا۔" اور وہ سر پہ چادر باندھنے لگا۔

نصیر پھر مسکرا دیا۔

"اچھا اُٹھا پھر۔"

سلیم نے چارا اُٹھا لیا۔

دونوں بھائی آگے پیچھے گھر داخل ہوئے۔ گلشن سلیم کو چارہ اُٹھائے دیکھ کر مسکرا دی اور نصیر سے کہا۔

"پتہ نہیں اس لڑکے کو کیا ہو گیا ہے۔ آتے ہی کھانا کھائے بغیر تمہاری

طرف چلا گیا تھا۔"

نصیر نے درانتی ایک طرف رکھ دی اور ہلکے سے مسکرا کر کہا۔

"کہتا ہے، اب میں تمہارے ساتھ کھیتی باڑی کا کام کروں گا۔"

غضنور نے تائید کی۔

"ٹھیک کہتا ہے، نوکری نہیں ملتی تو نہ سہی۔ گھر میں ہماری نگاہوں کے سامنے تو رہے گا نا۔ ملازم بھی تو باہر جا کر بیچارے دھکّے ہی کھاتے ہیں۔"

نصیر نے اپنی بیوی کو آواز دی۔

"کشور! تم آؤ مشین میں چارہ لگاؤ اور میں چلاتا ہوں۔ تم سلیم جاؤ جا کر کھانا کھاؤ۔"

سلیم زور سے چلایا۔

"بھابی کیوں لگائے گی۔ میں مشین چلاتا ہوں اور تم چارہ لگاؤ۔ آج کے بعد بھابی کوئی کام نہیں کرے گی۔"

سلیم نے بیلیں ایک طرف کر دیں اور مشین کا دستہ پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"چلو لگاؤ۔"

کشور بھی قریب آ گئی۔

"اچھا تم دونوں بھائی چارہ کتر دو۔ میں بھوسہ نکالتی ہوں۔ کتنے ٹوکرے نکالوں؟" اس نے نصیر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

سلیم نے پھر مداخلت کی۔

"بھوسہ بھی میں خود نکالوں گا بھابی! میں کہتا ہوں تم اب یہ کام

نہیں کروگی ۔ جاؤ جاکر آرام سے ماں کے پاس بیٹھو۔

کشور مسکراتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی ۔ نصیر چارہ لگانے لگا اور سلیم نے مشین چلانا شروع کر دی ۔ مشین چلاتے چلاتے وہ پھر بولا۔

"ان بیلوں میں تربوز ہیں، نکال لو بھابی ۔"

کشور نے تربوز نکال کر ایک طرف رکھ دیئے اور گلشن کے پاس جاکر بیٹھ گئی ۔

چارہ کُتر کر اُنھوں نے مویشیوں کے آگے ڈال دیا اور ایک بھینس کے آگے بیلیں پھیلا دیں ۔ نصیر نے گھوڑی کھولی اور اسے ذرا گھمانے باہر لے گیا ۔ اتنے میں حویلی کے باہر سے سلیم کو کسی نے آواز دی ۔

سلیم جب باہر آیا تو باہر اس کا ایک ہم عمر لڑکا ہی کھڑا تھا ۔ سلیم کو دیکھتے ہی اس نے کہا۔ "مجھے پتہ چل گیا تھا کہ تم آئے ہوئے ہو ۔ دریا میں کانگ آئی ہوئی ہے اور بہت لکڑی آرہی ہے آؤ پکڑنے چلیں ۔ میں اپنا گڈا گاؤں کے باہر کھڑا کر آیا ہوں اور ہمارے سارے ساتھی بھی وہاں انتظار کر رہے ہیں ۔"

سلیم نے رازداری سے کہا ۔

"تم چلو میں آتا ہوں ۔ باپو اور ماں سے چوری آنا پڑے گا ۔ میں اپنا کدّو اور کاچھا لے لوں ۔"

سلیم اندر آیا ۔ ایک بڑا سا سوکھا ہوا کدّو اور ایک کاچھا نکال کر اشارے سے کشور کو ایک طرف بُلاتے ہوئے دونوں چیزیں اسے تھما کر بڑی رازداری سے کہا۔ "بھابی ! میں باہر جاتا ہوں ۔ تم یہ دونوں چیزیں مجھے دیوار کے اُوپر سے

باہر دے دینا ۔ باپو اور ماں نے اگر دیکھ لیں تو باہر نہ جانے دیں گے ۔

"کہاں جاؤ گے ؟"

"دریا پر لکڑیاں پکڑنے" ۔

کشور نے ڈانٹ دیا ۔

"نہیں تم نہیں جاؤ گے سلیم ! دریا آج طوفان پر ہے ۔"

سلیم منت کرنے لگا ۔

"اچھی بھابی نہیں ۔"

"نہیں ۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں گہرے پانی میں نہیں جاؤں گا ۔"

"اگر تم گئے تو میں باپو اور ماں سے شکایت کر دوں گی ۔"

سلیم نے فوراً کشور کے پاؤں پکڑ لیے ۔

"لو بھابی تمہارے پاؤں پکڑتا ہوں ۔ باپو اور امّی سے نہ کہنا اور یہ دونوں چیزیں مجھے باہر پکڑا دو ۔"

کشور خاموش ہو گئی ۔ سلیم باہر نکل گیا ۔ کشور دونوں چیزیں لے کر باہر آئی اور دیوار کے اُوپر سے اُسے دیتے ہوئے کہا ۔

"دیر نہیں لگاؤ گے ورنہ باپو سے کہہ دوں گی ۔"

"ہاں جلدی آؤں گا ۔"

"اور گہرے پانی میں بھی نہیں جاؤ گے ۔"

"نہیں جاؤں گا ۔"

سلیم نے کاچھا اور کدو لیا اور ایک طرف بھاگ گیا۔

گڈے میں بیٹھ کر وہ سب دریا پر پہنچے۔ سب نے کپڑے اُتار کر کاچھے پہن لیے اور پیٹ کے نیچے کدو رکھ کر تیرتے ہوئے لکڑیاں پکڑنے لگے۔

شام سے ذرا پہلے تک لکڑیاں پکڑ پکڑ کر اُنھوں نے ڈھیر لگا دیے تھے پھر وہ کنارے پر آئے اور اِدھر اُدھر بھاگتے ہوئے کھمبیاں توڑنے لگے۔ پھر انھوں نے ساری لکڑی گڈے میں لادی اور گاؤں آکر لکڑی کے ٹھیکیدار کے پاس بیچ دی۔ بارہ بارہ روپے آئے تھے سب کے حصے میں۔

سلیم گھر داخل ہوا۔ نصیر بھینسوں کا دودھ نکال رہا تھا اور کشور نل پر بیٹھی پاؤں دھو رہی تھی۔ گلشن نے اُسے دیکھتے ہی پوچھا۔

"تم نے کھانا بھی نہیں کھایا بیٹے! کہاں سے لوٹے ہو اتنی دیر بعد۔"

سلیم جواب دیے بغیر ہی اندر چلا جانا چاہتا تھا کیونکہ باپو بھی وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ پھر جونہی وہ کمرے میں داخل ہوا غفور کی بھاری آواز سنائی دی۔

"سلیم!"

وہ جلدی جلدی اس کے قریب آکھڑا ہوا۔

"جی باپو!"

"کہاں چلے گئے تھے؟"

"کھمبیاں لایا ہوں باپو!"

"کہاں ہیں؟"

سلیم نے اسے دس بارہ کھمبیاں دکھا دیں۔ "تم تو انھیں بہت پسند کرتے

ہو باپو! اس لیے لایا ہوں۔"

"دریا کی طرف تو نہیں گئے تھے۔"

سلیم نے بڑے پیارے انداز میں کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"توبہ توبہ باپو! دریا میں تو ناگ آئی ہوئی ہے میں نے اُدھر کیا کرنے جانا ہے۔"

کشور اس کا جواب سن کر اتنا ہنسی اتنا ہنسی کہ اسے دوسروں سے اپنی ہنسی چھپانے کی خاطر منہ میں دوپٹے کا پلّو لینا پڑا۔

غفور خوش ہو گیا۔

"بہت اچھا بیٹا ہے۔ اس موسم میں دریا پر نہیں جانا چاہیے۔"

سلیم نے گلشن سے کہا۔

"بہت بھوک لگی ہے ماں!"

گلشن نے کشور کو آواز دی۔

"کشور! کھانا دو سلیم کو اُٹھ کر۔"

کشور نے پاؤں دھو کر جلدی جلدی جوتے پہنے اور دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی ہوئی وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ سلیم بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر چلا گیا اور میز کے سامنے کرسی لگا کر بیٹھ گیا۔

کشور نے اس کے سامنے کھانا رکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم تو کہتے تھے جلدی آجاؤں گا۔ باپو اور ماں نے کئی بار مجھ سے تمہارے متعلق پوچھا مگر میں نے کہا مجھے بتا کر نہیں گیا۔"

تو جلدی ہی آگیا ہوں نا بھابی! دیر تھوڑی ہی لگائی ہے۔
کشور نے اس کے سر پر چپت لگائی۔
"جھوٹا"
کشور جب جانے لگی تو سلیم نے جیب سے بارہ روپے نکالتے ہوئے کہا۔
"یہ پیسے لے لو بھابی!"
کشور اس کے قریب آئی۔
"لکڑی کے ہوں گے"
"تم رکھو میں نے کیا کرنے ہیں تمہارے کسی کام آئیں گے"۔
سلیم نے روپے زبردستی اسے تھما دیئے۔
"تم رکھ لو نا بھابی! اور ہاں وہ کھبیاں بھی بنا دو"
کشور باہر نکلنے لگی۔
"انڈے بھی ڈال دوں ان میں"
"ڈال دو۔ میں ابھی کھانا نہیں کھاتا۔ جب پکیں گی تو سارے اکٹھے بیٹھ کر ہی کھائیں گے"
کشور پھر واپس مڑی کھانا اُٹھا کر واپس رکھ آئی اور باہر آ کر آگ جلانے لگی سلیم باپو کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگا۔



(۳)

گرمی کی کمر ٹوٹ گئی تھی۔ باجرے کے سٹے، جوار کے خوشے اور مکئی کے بھٹے ہوا کے دوش پر فضاؤں میں ناچ اُٹھے تھے۔ کھیتوں پر جوبن تھا، ہواؤں میں رس اور مہک تھی۔ ہر چیز دُھلی دُھلی اور معطر سی تھی۔ فضاؤں میں گیت تھے خوشی اور سُرور کے۔
نصیر کھیتوں کا چکر لگاتا ہوا جب جنگل والی زمین میں پہنچا تو چودھری حاکم کے گھوڑے باجرے کے سٹے کھا رہے تھے۔ نصیر نے دونوں گھوڑے پچکار کر پکڑ لیے اور کانجی ہوس جا کر بند کر آیا۔
شام سے ذرا پہلے جب کہ سلیم مشین چلا رہا تھا اور نصیر اس میں باجرہ دے رہا تھا چودھری حاکم کا ایک آدمی آیا اور نصیر سے کہا۔

"چودھری تمہیں بلاتے ہیں۔"

نصیر نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیوں؟"

"یہ تو پتہ نہیں۔"

نصیر اس کے ساتھ ہو لیا۔ "چلو"

"میں بھی آؤں بھیا!" سلیم نے پوچھا۔

"نہیں کوئی ضرورت نہیں"۔ نصیر اس کے ساتھ باہر نکل گیا۔ کشور آکر مشین میں باجرہ دینے لگی اور سلیم پھر اسی طرح مشین چلانے لگا۔

نصیر چودھری حاکم کی حویلی میں داخل ہوا۔ وہ اپنے دونوں بیٹوں اختر اور اشرف کے ساتھ صحن میں بیٹھا ہوا تھا۔ نصیر کو دیکھتے ہی چودھری اٹھ کھڑا ہوا اور گرج کر بولا۔

"تم نے میرے گھوڑے کانجی ہاؤس دینے کی جرأت کیسے کی"۔ چودھری کی لمبی لمبی مونچھیں بری طرح کانپ رہی تھیں۔

نصیر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"باندھ کر رکھا کریں نا۔ کیوں کھلے چھوڑتے ہیں۔ ہماری سال بھر کی محنت کو خراب کرتے پھرتے ہیں۔"

"تمہیں پتہ ہے میرے گھوڑے کبھی نہیں بندھے۔"

"کھلے بھی نہیں پھریں گے۔"

"کون روکے گا؟"

نصیر نے اپنی چھاتی پر ہاتھ مارا۔

"میں روکوں گا۔"

چودھری کا منہ جھاگ چھوڑنے لگا۔

"میں تمہارے ٹکڑے کر دوں گا۔"

"ہوش میں رہو چودھری! تم جاگیردار ہو تو اپنے گھر میں ہو۔ ہم دن رات محنت کر فصلوں کو جوان کرتے ہیں اور تمہارے گھوڑے انہیں روندتے پھرتے ہیں۔"

چودھری چلایا۔

"روندیں گے۔ روندیں گے۔"

"پھر خون بھی بہے گا۔"

"خون بہائے گا کون۔ تم صرف پانچ بھائی ہو اور میرے ایک اشارے پر سینکڑوں جوان اٹھ کھڑے ہوں گے۔"

"ہم پانچ بھائی پنجاب کے پانچ دریا ہیں جو اگر طوفان پر آئے تو تمہاری بستی تک کو بہا کر لے جائے گا۔"

"ہوں! ایسے خشک دریا پنجاب میں میں نے بہت دیکھے ہیں۔ جنہیں لوگ اپنے پاؤں سے روندھ کر ان میں سے گزرتے ہیں۔"

"تو پھر اب اپنے مویشی اور گھوڑے کھلے چھوڑ کر دیکھنا۔"

"چھوڑوں گا۔ دیکھتا ہوں کون روکتا ہے۔"

"میں روکوں گا اور جو سامنے آئے گا وہ زندہ نہیں بچے گا۔" نصیر غصے میں باہر نکل گیا۔

کوئی ایک ہفتے بعد چودھری کے مویشی پھر اس کے کھیت میں گھس گئے۔ نصیر نے سارے مویشی ایک جگہ جمع کیے۔ چودھری کے نوکر آڑے آئے مگر اس نے مار کر بھگا دیئے اور سارے مویشی کانجی ہاؤس دے آیا۔

چودھری نے اس واقعہ کا کوئی اثر نہ لیا۔ بالکل خاموش رہا تھا۔ کوئی ایک ماہ گزر گیا۔ نصیر ہل چلا کر واپس لوٹ رہا تھا کہ گاؤں کے باہر ہی کھاد کے ایک ڈھیر کے پیچھے سے چودھری حاکم کے آدمی نکلے اور نصیر پر حملہ کر دیا۔ قبل اس کے کہ وہ بچارہ سنبھل کر اپنے دفاع کی کوشش کرتا چودھری کے آدمیوں نے کلہاڑیاں مار مار کر اسے موقع پر ہی ختم کر دیا۔

سلیم اور کشور دونوں چارہ کتر رہے تھے کہ دونوں بیل حویلی میں داخل ہوئے اور صحن میں آ کر کھڑے ہو گئے۔ سلیم نے مشین چلانا بند کر دی۔

"بھیا پتہ نہیں کدھر گئے ہیں۔"

اس نے آگے بڑھ کر ہل اتاری پھر پنجالی علیحدہ کی۔ دونوں بیلوں کو نل کا ٹھنڈا پانی پلایا اور ناند پر باندھ کر چارہ ڈال دیا۔ اتنے میں باہر مرد اور عورتیں شور کرنے لگے نصیر قتل ہو گیا۔ چودھری کے آدمیوں نے اسے مار ڈالا ہے۔ اس کی لاش گاؤں سے باہر پڑی ہے۔ ہم خود دیکھ کر آئے ہیں۔

سلیم نے دکھ سے کہا۔

"بھیا قتل ہو گئے" اور وہ باہر بھاگا۔

کشور نے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔

"ہائے میرے اللہ!"

غفور بچارہ بوکھلا کر اٹھا۔

"کیا ہوا میرے بچے کو۔ جلدی جلدی جوتیاں پہن کر وہ بھی باہر بھاگا۔ گلشن چلا کر صحن میں گر گئی۔

سلیم جا کر نصیر کی لاش اٹھا لایا۔ سب رو رہے تھے۔ گلشن اور کشور بال نوچ رہی تھیں۔ بوڑھا غفور لمبی لمبی آہیں بھر رہا تھا۔ سلیم بچارہ بھی لاش کے پاس بیٹھا رو رہا تھا۔

قریب والے تھانے کی پولیس آگئی تھی اور اپنی کارروائی کر کے چلی گئی تھی۔ سلیم کے بڑے بھائی ظفر، شبیر اور بشیر تینوں فوج میں تھے۔ منشی امین جا کر انہیں تار دے آیا تھا۔

صبح تک لاش رکی گئی۔ ظفر، شبیر اور بشیر بھی آگئے اور پھر ان کی موجودگی میں نصیر کو دفن کر دیا گیا۔ پورے گاؤں کا ماحول اداس ہو گیا تھا۔ چودھری حاکم نے جنازے میں شرکت تو کجا ان کے گھر جا کر افسوس بھی نہ کیا تھا۔ چور اور مجرم جو تھا۔

کوئی ہفتہ گزر گیا۔ جب کہ سلیم بھینسوں کا دودھ نکال کر فارغ ہوا تھا کہ ظفر اس کے پاس آیا اور بڑی رازداری سے کہا۔

"تم باپو، ماں اور کشور کو لے کر کچھ دنوں کے لیے ماموں کے ہاں چلے جاؤ سلیم!"

سلیم چونک پڑا۔

"کیوں؟"

"ہم اب چودھری حاکم کو قتل کر کے ہی جائیں گے۔ اس نے ہمارا بازو توڑا ہے ہم اس کی گردن ضرور کاٹیں گے۔

شبیر اور بشیر بھی وہیں آ کھڑے ہوئے۔

سلیم کی گردن جھک گئی اور وہ کچھ سوچنے لگا۔ اتنے میں غفور، گلشن اور کشور بھی وہیں آ کھڑے ہوئے۔ بعد میں کشور کا چھوٹا بھائی سجاد بھی اداس اداس سا ان کے پاس آ گیا۔

ظفر نے پھر سلیم کو مخاطب کیا۔

"تم چپ کیوں ہو گئے ہو۔

"مجھے تم سے اتفاق نہیں بھیا! تم تینوں چھٹی گزار کر اپنی اپنی نوکری پر چلے جاؤ۔ یہ معاملہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ تم تینوں بے شک بڑے ہو اور مجھ سے بہتر ہی فیصلہ کرو گے۔ پر میری یہ صلاح ہے کہ تم لوگ خاموش رہو۔ قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی ضرورت نہیں۔ اس طرح ہماری الجھنوں میں اور اضافہ ہو جائے گا مقدمہ تو عدالت میں چل ہی گیا ہے نا۔ ہمیں صبر سے کام لے کر قانون کے فیصلے کا انتظار کرنا چاہیے۔ سب کے سامنے دن دہاڑے قتل ہوا ہے مجھے امید ہے عدالت مجرموں کو کبھی معاف نہیں کرے گی اور پھر قاتل پکڑے گئے ہیں اور جیل میں ہیں۔

شبیر نے غصے میں کہا۔

اس طرح تو چودھری شیر ہو جائے گا۔

سلیم نے پھر بڑے اطمینان سے کہا۔

"شیر اس نے کیا ہونا ہے۔ اس کے آدمی قانون کی گرفت میں ہیں۔ تم لوگ جذباتی بن کر فیصلہ نہ کرو۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا، یہیں رہوں گا کھیتی باڑی بھی کروں گا اور قانون کا دروازہ کھٹکھٹا کر انصاف بھی مانگوں گا۔

بشیر نے اور ہی صلاح دی۔

"یا پھر ایک کام کرو۔ تم کہیں نوکری کر لو۔ ہم تینوں میں سے ایک نوکری چھوڑ کر گھر کا کام کرے گا۔ تم نے تو آج تک کام ہی نہیں کیسے سنبھالو گے یہ دھندا۔

"میں سنبھال لوں گا۔ تم لوگ لگی لگائی نوکری نہ چھوڑو۔"

غفور بھی بولا۔

سلیم ٹھیک کہتا ہے میرے بچو! قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے چودھری کے قتل کا ارادہ تم لوگ اپنے دل سے نکال دو مقدمہ تو چل ہی گیا ہے۔ عدالت ضرور انصاف کرے گی۔

کشور بھی بولی۔

باپو ٹھیک کہتا ہے۔ کوئی ضرورت نہیں ہمیں قتل کرنے کی۔

گلشن نے روہانسی آواز میں کہا۔

کن بکھیڑوں میں پڑ گئے ہو۔ میرے بچو! تم تینوں جاؤ اپنی اپنی نوکری پر سلیم ہمارے پاس رہے گا گھر کا کام یہ سنبھال لے گا۔ میں اور کشور بھی اس کی مدد کرتی رہا کریں گے۔ ہم غریب لوگ قانون کو ہی پکار سکتے ہیں قتل کا جواب قتل نہیں دے سکتے۔

چلو تم سب ناشتہ کر لو۔

(۴)

جوان بیٹا قتل ہو گیا تھا۔ گھر کی ساری پونجی ختم ہو چکی تھی۔ مگر ——— مگر عدالت کا منہ ابھی تک کھلا تھا۔ وکیلوں کے ہاتھ ابھی تک پھیلے ہوئے تھے۔ عدالت میں مقدمہ کی گاڑی چلانے کے لیے دلیل پہیے کا کام دیتے ہیں۔ مگر ان پہیوں میں ہوا نہیں نوٹ بھرے جاتے ہیں۔ خون پسینے کی گاڑھی محنت سے کمائے ہوئے نوٹ۔

مقدمے میں وہ بچارے اب سب کچھ کھو بیٹھے تھے مگر مقدمہ ابھی تک ختم نہ ہوا تھا۔ کیس چھوٹی عدالتوں سے نکل کر سیشن کورٹ میں چلا گیا تھا۔ سلیم ان تھک محنت کر رہا تھا۔ کھیتی باڑی کا کام جو اس نے پہلے کبھی نہ کیا تھا اب وہ اکیلا ہی سنبھالے ہوئے تھا۔

ایک روز وہ زمین جوت کر واپس آیا۔ نہا دھو کر کھانے کے بعد وہ چارہ لانے کے لیے باہر جانے لگا تو گلشن نے اسے روکا۔ سلیم ماں کے پاس آکھڑا ہوا۔

گلشن نے دکھ سے کہا۔

بابا کہتا ہے وکیل پیسوں کا بہت تقاضا کر رہا ہے۔

غفور اور کشور بھی ان کے پاس آکھڑے ہوئے۔

گھٹی گھٹی سی آواز میں سلیم نے پوچھا۔

"پھر کیا کریں؟"

ہارے ہوئے انداز میں گلشن نے کہا۔

"میں تو کہتی ہوں زمین بیچتے ہیں۔"

سلیم تڑپ گیا۔

"نہیں، نہیں ماں! میں زمین نہ بیچنے دوں گا۔ میں خود مٹ جاؤں گا بک جاؤں گا مگر زمین نہ بکنے دوں گا۔ زمین ———

زمین کسان کی بنیاد ہوتی ہے ماں!

زمین غریب کے پاؤں ہوتے ہیں۔

بنیاد نہ رہے تو مکان بھی نہیں رہتا۔

پاؤں نہ ہوں تو انسان بے کار ہو جاتا ہے۔

تم مجھے بیچ دو ماں! مجھے' پر زمین نہ بیچو! یہ ہمارا آخری سہارا ہے جو چھن گیا تو دنیا کا کوئی فرد بھی ہمیں سہارا نہ دے گا۔

گلشن رو دی۔

"پھر کیا کریں۔"

"میں اُدھار لے لیتا ہوں۔"

"کہاں سے لوگے ادھار"

میں منشی امین سے لے لوں گا۔

اتارے گا کون

میں اتاروں گا ماں! تم کیوں فکر کرتی ہو۔ میں ہل کی نوک سے دن رات اس دھرتی کا سینہ کھود کر گندم کی شکل میں اس میں سے سونا نکالوں گا۔ تم دیکھتی رہو ماں! میں پیداوار پہلے سے دُگنی کر دوں گا۔

سلیم نے ایک طرف بندھی ہوئی گدھی کھولی، قریب ہی پڑا ہوا ٹاٹ اس پر ڈالا اور پھر دروازے کی طرف جاتے ہوئے گلشن سے پوچھا۔

"میں چارہ بھی لے آتا ہوں ماں! اور منشی امین سے قرض کی بات بھی کر لوں گا۔ کتنی رقم سے کام چل جائے گا۔"

گلشن کے بجائے غفور نے ذرا سوچ کر جواب دیا۔

دس ہزار تو ہو۔

سلیم جب باہر نکلنے لگا تو کشور نے پوچھا۔

"میں بھی چارہ لانے کے لیے چلوں ساتھ۔"

سلیم نے رک کر غور سے اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں بھابی! تم باہر کا کوئی کام نہیں کیا کرو گی۔ یہ سب میرے فرائض ہیں۔ ہاں گھر کے اندر کا کام اپنی خوشی سے کر دیا کرو تو میں تمہارا مشکور رہوں گا۔

سلیم باہر نکل گیا۔

منشی امین کی حویلی کے پاس آ کر اس نے گدھی باہر کیکر کے درخت سے باندھی اور دکان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ امین انجن چلانے کی تیاری کر رہا تھا۔ سلیم کو دیکھتے ہی اس نے بڑی ہمدردی سے کہا۔

"اندر آ جاؤ نا، باہر کیوں کھڑے ہو گئے ہو۔"

دِل دُکھانے والی آواز میں سلیم نے کہا۔

"میں آج منشی جی ایک سوال لے کر آیا ہوں تمہارے پاس۔"

امین اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لایا۔

پہلے اندر آ کر بیٹھو تو سہی پھر کہو کیا کہنا ہے

سلیم کھاٹ پہ بیٹھ گیا۔

مجھے کچھ رقم چاہیے منشی جی۔

امین بھی اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"کتنی؟"

"دس ہزار۔"

"کب تک چاہیے۔"

"آج ہی دے دیں تو مہربانی ہے۔"

امین نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی

شام تک تمہارے گھر پہنچا دوں گا۔ تمہیں دوبارہ آنے کی ضرورت نہیں۔

سلیم کھڑا ہو گیا۔

"اچھا میں چلتا ہوں۔"

"بیٹھو نا۔"

نہیں گدھی باہر باندھی ہے۔ چارہ لینے جا رہا ہوں۔ سلیم گدھی کی لگام پکڑے دریا کی سمت چلا گیا۔

شام ہو گئی تھی ہر سو چاندنی ہی چاندنی تھی سلیم کھانا کھا کر اٹھا اور ہل پنجالا اٹھا کر باہر لے جانے لگا۔ غفور نے حیرت سے پوچھا۔

"کیا کرنے لگے ہو بیٹا!"

دھیمی سی آواز میں سلیم نے جواب دیا۔

ربیع کی بوائی قریب آ گئی ہے باپو! چاندنی راتیں ہیں اب رات کو بھی ہل چلایا کروں گا۔

گلشن نے سمجھایا۔

"دن کو بھی سارا دن کام کرتے کرتے تھک جاتے ہو بیٹا! رات کو ہل کیسے چلاؤ گے۔"

سلیم ٹال گیا۔

"یہ بھی کوئی کام ہے ماں!"

کشور بھی بولی۔

"بیل بیچارے دن رات کیسے چلیں گے۔"

میں رات کو بیل نہیں جوتوں گا۔ اس گدھی اور بھینس کا دن کے وقت کوئی کام نہیں ہوتا رات کے وقت ان کو جوتوں گا۔"

ہل اور جوا سلیم باہر رکھ کر اندر آیا تو دروازے پر کسی نے دستک دی۔

کون ہے غفور نے پوچھا۔

باہر سے بڑی مدھم اور رازدارانہ آواز آئی۔

"میں منشی امین ہوں۔"

"منشی جی اندر آ جائیں نا" سلیم نے کہا۔

امین اندر آیا اس کے پیچھے پیچھے حنیف بھی تھا۔ دونوں صحن میں پڑی ہوئی کھاٹ پر آ کر بیٹھ گئے۔ امین نے جیب سے جلدی جلدی نوٹ نکالے۔

"یہ اپنی رقم لو سلیم!"

حنیف بھی اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹ نکالنے لگا تھا۔

سلیم نے امین سے رقم لے لی۔

"منشی جی! بہت مہربانی۔"

"گن لو۔"

"تم نے نہیں گنی۔"

"میں تو دس ہزار گن کر لایا ہوں۔"

"تو پھر کیا ضرورت ہے"

"تسلی اچھی ہوتی ہے۔"

"اوں ہوں۔"

حنیف نے بھی کچھ نوٹ اس کی طرف بڑھائے۔

"یہ دو ہزار مجھ سے بھی لے لو سلیم۔ امین کی زبانی تھوڑی دیر پہلے

پتہ چلا تھا کہ تمہیں مقدمے کے لیے رقم کی ضرورت ہے ۔ گھر پہ یہی تھے ۔ باقی رقم ڈاک خانے میں جمع ہے ۔ جب اور جس وقت بھی چاہیئے مانگ لینا اور یہ رقم بھی جب چاہے واپس کرنا ۔ یہ بھی ہو سکے تو ہم تقاضا نہیں کریں گے ۔"

سلیم نے دل گیر سی آواز میں کہا ۔

"میں تم دونوں کا بے حد مشکور ہوں ۔"

"شکریہ کیسا بیٹا !"

حنیف نے کہا "تم پر مصیبت آن پڑی ہے اور مصیبت کے وقت کسی کے کام آنا ہر انسان کا فرض ہے ۔ وہ انسان ہی کیا جو دوسروں کو تکلیف میں دیکھ کر منہ پھیر لے ۔ بھائی کے قتل کے بعد پڑھے لکھے ہو کر تم نے جس طرح گھر کا نظام سنبھالا ہے سب ہی لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں ۔ اندر ہی اندر سب لوگ تمہارے ساتھ ہیں ۔ کیا ہوا چودھری حاکم دین خوف کے باعث اگر کوئی سرِ عام ہمدردی کا اظہار نہیں کرتا ۔ انسان پر سدا ایک جیسا دور نہیں رہتا ۔ وقت اپنے آپ کو ضرور بدلتا ہے ۔"

سلیم نے بڑی ممنونیت سے کہا ۔

"یہ تو آپ کے اپنے خیالات ہیں نا ماسٹر جی ! اور ہر کوئی ماسٹر حنیف اور منشی امین تو نہیں ہو سکتا ۔ مصیبت کے وقت جب کہ سب لوگ مجھ سے آنکھیں پھیر رہے ہیں ۔ تم دونوں نے اتنی بڑی رقم کا انتظام کر کے ثابت کر دیا ہے کہ اس دنیا میں ابھی تک انسان بھی بستے ہیں ۔"

"بار بار شکریہ ادا کر کے کیوں شرمندہ کرتے ہو بیٹا !"

منشی امین کھڑا ہو گیا ۔

"ہم اب چلتے ہیں سلیم !"

سلیم نے دونوں کے بازو پکڑ لیے ۔

"بیٹھیں کھانا کھا کر جائیں ۔"

"نہیں کھانا تو ہم کھا کر آئے ہیں ۔"

سلیم کے روکنے کے باوجود دونوں چلے گئے ۔ سلیم نے ساری رقم اٹھا کر غفور کی جھولی میں ڈال دی ۔

"یہ لو بابو !"

غفور اٹھا اور رقم سنبھالنے کے لیے اندر چلا گیا ۔

گلشن اور کشور کے منع کرنے کے باوجود وہ ہل جوت کر چلا گیا ۔ گاؤں کی گلیوں سے جب وہ گزر رہا تھا تو ایک گھر کی چھت پر ڈھولک بج رہی تھی اور لڑکیاں گیت گا رہی تھیں ۔ شاید کسی کی شادی تھی ۔

گاؤں کے جوہڑ کے پاس سے گزر کر جب وہ ذرا اور آگے بڑھا تو کچھ بے فکرے جوان باہر بندھے ہوئے اپنے مویشیوں کے پاس بیٹھے مدھر سُروں میں ہیر گا رہے تھے سلیم ان کے پاس سے گزرتا ہوا دریا کی سمت بڑھنے لگا ۔



(۵)

ربیع کی بوائی شروع ہو گئی تھی ۔ کسان دن رات کام میں مصروف تھے
سلیم بھی رات دن ایک کیے ہوئے تھا ۔ غفور، گلشن اور کشور بھی اس کا ہاتھ
رہے تھے ۔ ایک روز دوپہر سے ذرا پہلے کشور سلیم کے لیے کھانا تیار کر رہی تھی
کہ اس کی ماں آگئی ۔ غفور اور گلشن سے ملنے کے بعد اس نے سجاد کو پیار کیا اور
پھر آکر کشور کے پاس بیٹھ گئی ۔

کشور نے پراٹھے پر گھی لگاتے ہوئے پوچھا ۔

"گھر میں خیریت ہے نا امی"!

"سب خیریت ہے، میں تو تمہیں لینے آئی ہوں"۔

"کیوں ؟"

"لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں ۔ کہتے ہیں تمہاری لڑکی عدت کے
دن بھی پورے کر چکی پھر وہاں کیوں بٹھا رکھی ہے ۔ کہیں اور شادی کر دو اس کی"۔

کشور غمزدہ اور پیلی ہو گئی ۔

"کون کہتا ہے ؟"

"سب ہی کہتے ہیں بیٹی ! کسی کے منہ پر ہاتھ تھوڑا ہی رکھا جا سکتا ہے
تم کام سے فارغ ہو اور آج ہی چلو میرے ساتھ"۔

کشور رو پڑی ۔

"میں نہیں جاؤں گی امی !"

"کیوں نہیں جاؤ گی ؟"

"تم نے بیاہ کر مجھے اس گھر میں بھیج دیا تھا ۔ اب اس گھر سے میرا جنازہ ہی
اٹھے گا ۔ میں اس وقت تک اس گھر سے نہیں جاؤں گی جب تک باپو اور ماں
اپنی زبان سے نہیں کہتے کہ چلی جاؤ"۔

"کس آس پر یہاں بیٹھی رہو گی"۔

"بس یہ میرا گھر ہے ۔ مجھے اس کی ہر چیز سے پیار ہے"۔

"تو میں گلشن سے اس سلسلہ میں بات کروں"۔

کشور نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ۔

"کر لو"

وہ اُٹھ کر گلشن کے پاس آئی اور اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا ۔

"میں کشور کو لینے آئی ہوں بہن ! تمہارا کیا خیال ہے"۔

گلشن نے پریشانی سے پوچھا۔

"لینے آئی ہو، پر کیوں؟"

"لوگ باتیں کرتے ہیں کہ جوان بیٹی کو اب خواہ مخواہ وہاں بٹھا رکھا ہے۔"

گلشن نے غصے میں کہا۔

"خواہ مخواہ کیوں۔ کشور کا اپنا گھر ہے اس کے بغیر رہنے کا تو میں سوچ بھ
نہیں سکتی"۔

"پھر بھی بہن لوگوں کا منہ بند کرنے کے لیے مجھے کشور کو لے جانا ہی ہوگا۔"

"ٹھہرو، میں بابا سے بات کرتی ہوں۔"

"کر لو۔"

گلشن اٹھ کر غفور کے پاس آئی۔ لکڑی کے تخت پوش پر بیٹھا وہ حقہ
تھا۔ گلشن اس کے پاس بیٹھتی ہوئی غمزدہ سے لہجے میں بولی۔

"بابا! ایک نئی مصیبت آن پڑی ہے۔"

غفور نے حقے کی نال ایک طرف کر دی۔

"کہو بیٹی!"

"کشور کی ماں اسے لینے آئی ہے۔"

غفور پریشان ہو گیا۔

"کیوں؟"

"بس! کہتی ہے لوگ طعنہ دیتے ہیں کیوں بیٹی کو اب وہاں بٹھار

"ایک بات کہوں؟"

"جی"

"ہمارے چار بیٹے ہیں۔ کشور کا نکاح ہم ان میں سے کسی سے کر دیتے ہیں۔
پہلے اس کا عندیہ لیتے ہیں جس سے وہ کہے گی اس سے اس کی شادی کر دیتے ہیں۔
تمہارا کیا خیال ہے۔

مجھے تم سے اتفاق ہے بابا!

غفور نے وہیں بیٹھے بیٹھے پکارا۔

"کشور"

وہ چھپیا میں پراٹھے جما رہی تھی۔

"جی بابو!" روہانسی آواز میں اس نے کہا۔

"ادھر آؤ بیٹی!"

کشور اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

غفور نے اپنے دائیں طرف تخت پوش پر ہاتھ مارا۔

"بیٹھو ادھر۔"

کشور چپ چاپ بیٹھ گئی۔

"تمہیں پتہ ہے تمہاری امی تمہیں لینے آئی ہے۔"

کشور پھر رو دی۔

"جی ہاں۔"

غفور پگھل گیا۔

"رو رہی ہو بیٹی!"

کشور ٹال گئی - جی ـــــــ وہ

"تم جانا چاہتی ہو بیٹی!"

کشور نے سِسکی لی -

"باپو! یہ میرا گھر ہے - مَیں اس وقت یہاں سے جاؤں گی جب آ اپنی زبان سے کہہ دوگے کہ چلی جاؤ۔"

"پھر ایک بات پوچھتا ہوں۔"

"پوچھیں۔"

"ہم چاہتے ہیں تم ہمیشہ اس گھر میں رہو - تم مظفر، بشیر، شبیر ا سلیم جس سے بھی شادی کرنا چاہتی ہو بتاؤ اس سے ہم تمہاری شادی کر دیں گے"

کشور کا سَر جھک گیا اور وہ خاموش رہی -

غفور نے اس کے سَر پہ ہاتھ رکھ دیا -

"شرماؤ نہ بیٹی! یہ تمہاری زندگی کا سوال ہے - بولو ہچکچاتی کیوں ہو مَیں تمہارا باپو ہوں اور یہ تمہاری ماں ہے ۔"

کشور کا سَر جھکا ہوا تھا - آہستہ آہستہ وہ کھڑی ہوئی اور باورچی خانے ک طرف جاتے ہوئے دھیمی سی آواز میں اس نے کہہ دیا -

"سلیم۔"

غفور اور گلشن دونوں کے چہروں پہ مسکراہٹ بکھر گئی - کشور کی ماں ساری باتیں سُن رہی تھی وہ بھی بے حد مطمئن دکھائی دے رہی تھی -

کشور باورچی خانے میں آئی - دھاگے کے پھول لگی ہوئی ایک چھبیا

اس نے رومال پھیلایا اور اس میں دو پراٹھے رکھ کر ڈھانپ دیئے - پھر چینی کے ایک پیالے میں مکھن رکھا اور اس پر شکر ڈال دی - باہر آ کر ایک کوری ہنڈیا سے جس کا منہ رومال سے بندھا ہوا تھا اس نے آم اور لیموں کا اچار نکال کر ایک دوسرے پیالے میں ڈالا اور باورچی خانے میں لے آئی -

پھر دوبارہ باہر آئی - ایک صاف ستھری اور کوری مٹی کی ٹھلیا اٹھائی اور برآمدے میں پڑی ہوئی لسّی کی چاٹوری میں سے اس نے ٹھلیا لسّی کی بھر کر اس میں نمک ڈال لیا - دوبارہ باورچی خانے میں آ کر اس نے ٹھلیا پہ ڈھکن رکھا - پھر چھبیا جس میں پراٹھے تھے اس پہ رکھی اور مکھن کا پیالہ اور اچار کا برتن چھبیا پہ رکھ کر اس نے پھول کاڑھے ہوئے ایک بڑے رومال سے انہیں ڈھانک دیا - باہر آ کر اس نے گلشن سے کہا -

"ماں! مَیں کھانا لے جا رہی سلیم کا۔"

گلشن جو اس کی ماں کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی کھڑی ہو گئی -

"مولی کا بیج بھی لے جاؤ نا - مَیں لے آتی ہوں - صبح وہ کہہ گیا تھا، کہ گندم میں مولیاں لگا دیں گے میٹھی ہوتی ہیں - مَیں نے بہت ڈھونڈا تھوڑا سا ملا ہے۔"

"دے دو نا۔"

رومال میں بندھا ہوا بیج گلشن نے کشور کو دے دیا - کشور نے سَر پہ کھانا اٹھایا اور ہاتھ میں بیج لے کر وہ باہر نکل آئی -

سلیم کے پاس جب وہ پہنچی تو وہ ایک کیکر کی چھدری چھاؤں میں لیٹا ہوا

تھا۔ پنجالی میں جُتے ہوئے بَیل بھی اس کے پاس ہی تھے۔ ایک بَیل بیٹھا ہوا تھا اور دُوسرا کھڑا تھا۔ دونوں جگالی کر رہے تھے۔

کشور نے کھانا زمین پر رکھا اور سلیم کا بازو پکڑ کر ہلایا۔

"سلیم!"

وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور آنکھیں ملنے لگا۔

"سو گئے تھے۔"

"بیج ہی ختم ہو گیا تھا۔ گندم تو مَیں نے ساری بو دی ہے۔ صرف مولی کا بیج رہ گیا ہے۔ لائی ہو کیا۔"

"ہاں لائی ہوں۔ رومال میں بندھا ہُوا بیج کشور نے اسے تھما دیا۔

"آج تو بہت دیر سے لائی ہو کھانا۔ مجھے تو سخت پیاس لگی ہوئی ہے اور بھُوک بھی۔"

"امی آئی ہوئی ہے اس کے پاس بیٹھ گئی تھی۔"

سلیم نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

"روتی بھی رہی ہو؟"

کشور نے دوپٹے سے مُنہ پونچھا۔

"نہیں تو۔"

سلیم نے شوخی سے کہا۔

"دیکھو بھابی میرے سامنے جھوٹ نہ بولا کرو۔"

کشور کا سَر جھک گیا اور اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"باپو یا ماں نے کچھ کہا ہے۔"

کشور نے نفی میں سَر ہلا دیا۔

"میری کسی بات کا بُرا مانا ہے۔"

اس نے پھر نفی میں سَر ہلا دیا۔

"پھر کیا بات ہے۔"

کہیں دور سے کشور بولی۔

"کچھ بھی نہیں۔"

"اچھا پھر لسّی پلاؤ سخت پیاس لگی ہے"۔

کشور نے اس کے سامنے کھانے کے برتن پھیلا دیئے۔

"پہلے کھانے کے دو لقمے لگا لو پھر لسّی پینا"۔

سلیم کھانا کھانے لگا۔ کشور اس کے سامنے بیٹھی جانے کن سوچوں میں اُلجھی ہوئی تھی۔ کھانے سے فارغ ہو کر سلیم نے بیٹھے ہوئے بَیل کو اُٹھایا اور جُوئے کے ساتھ ہل درست کرنے لگا۔

"کتنا کام ہے اب"۔ کشور نے پوچھا۔

"بس یہی مولی کا بیج ہی پھینکنا ہے۔

"کتنی دیر لگاؤ گے؟"

"بس دس پندرہ منٹ"۔

"مَیں پھر بیٹھتی ہوں اکٹھے ہی چلتے ہیں"۔

سلیم نے بیج لے کر جھولی میں ڈال لیا اور بَیل زمین میں ڈال دیئے۔

"ٹھیک ہے۔"

بیج ختم کر کے سلیم نے بیلوں کو روکا۔ پہلے بیج کے لیے اپنے پیچھے باندھ ہوئی جھولی کھولی پھر ہل نکال کر پنجالی پر جمانے کے بعد وہ کیکر کے پاس آیا ا اپنی کلہاڑی اٹھا کر کندھے پر رکھتے ہوئے اس نے کشور سے کہا۔

"چلو چلیں"۔

وہ اٹھ کر اس کے ساتھ ہولی۔

دونوں گاؤں سے جب قریب آئے تو جوہڑ کے پاس سے گزرنے وا راستے کے کنارے گاؤں کے کچھ لڑکے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے سل سے کہا۔

"ذرا بات سننا سلیم!"

وہ رک گیا۔

"کہو۔"

"آج کبڈی ہے شام سے ذرا پہلے ضرور آنا۔ وہ گاؤں کے پر جانب فتح محمد کا آٹھ بیگھہ زمین کا ٹکڑا ہے نا وہ خوب جوتا ہوا اور ہموار کیا ہ ہے۔ اس میں ہوگی کبڈی۔ ہم تمہارا انتظار کریں گے۔ کہیں یہ نہ کہہ دینا ک باپو نہیں آنے دیتا۔"

"کبڈی ہے کس کے ساتھ؟"

"ہمارے ساتھ پدر، چاندی کوٹ، مچھرالہ، جبلانی اور آدم پ والے ہوں گے۔ مخالف والوں میں جون پور، چمرا، خودلتھی، جوگی کوٹ، ا

کچاں والی اور مرالہ والے ہوں گے۔

"دیکھو سلیم! تم کبھی کبھی دھوکہ دے جاتے ہو۔ آج مقابلہ بڑا سخت ہو گا۔ تم اگر نہ آئے تو ہمارے ہارنے کا خطرہ ہے اور اگر تم نہ آئے تو ہم میں سے کوئی بھی تمہارے ساتھ بات نہ کرے گا۔"

سلیم مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

"ضرور آؤں گا۔ تم فکر نہ کرو۔"

بیل آگے نکل گئے تھے۔ کشور بھی ان کے ساتھ تھی۔ تیز تیز قدم اٹھا کر جب وہ اس سے آملا تو اس نے بڑی رازداری سے پوچھا۔

"کیا کہتے ہیں؟"

سلیم نے ٹالنا چاہا۔

"کچھ بھی نہیں کہنا کیا ہے۔"

"پھر بھی کچھ کہا تو ہے۔ چھپاتے کیوں ہو۔"

"کبڈی کا میچ ہے آج۔"

"تمہیں بلایا ہوگا۔"

"ہاں"

دونوں حویلی میں داخل ہوئے۔ کشور کی امی سے ملنے کے بعد سلیم نے جلدی جلدی بیل علیحدہ کر کے باندھے پھر چارے کا انتظام کیا اور مویشیوں کے آگے ڈال کر وہ باہر جانے کو بے تاب نظر آنے لگا۔ باپو سامنے تخت پوش پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس لیے باہر جانا ذرا مشکل تھا۔

آخر اُسے ایک ترکیب سوجھی، اندر جا کر کشور سے لنگوٹا لیا اور پھر گھوڑی کھول کر باہر جانے لگا۔

غفور نے فوراً پوچھ لیا۔

"کدھر چلے ہو سلیم!"

"ذرا گھوڑی کو دوڑا لاؤں اور نہا بھی آؤں گا باپو!"

غفور مطمئن ہو گیا۔

"جلدی آنا بیٹے! مجھے تم سے ایک ضروری کام بھی ہے۔"

سلیم مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔

کبڈی کھیل کر وہ واپس آیا اور گھوڑی باندھ کر وہ باپو کی نظر بچا کر لنگوٹا کشور کو دینا چاہتا تھا کہ غفور نے اسی وقت بلا لیا۔

"اِدھر آؤ سلیم!"

ایک ہاتھ میں لنگوٹا لے کر اسے پُشت میں چھپاتے ہوئے وہ غفور کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"جی باپو!"

کشور بھی اس کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ شاید وہ کچھ سوچ کر ہی آئی تھی۔ دونوں کی نگاہیں ملیں، آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں ہوئیں اور پھر باپو کی نظر بچا کر سلیم نے لنگوٹا کشور کو تھما دیا جسے وہ غفور کی نظروں سے بچاتی ہوئی اندر لے گئی۔

غفور نے بیٹھنے کو کہا اور وہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"میں نے ایک فیصلہ کیا ہے سلیم!"

اس نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

"کیا باپو!"

"تمہاری اور کشور کی شادی کا۔"

کشور بھی ساتھ والے کمرے میں ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اس کی امی اور گلشن باورچی خانے میں ہانڈی پکا رہی تھیں۔

سلیم فوراً کھڑا ہو گیا۔

"میں شادی نہیں کروں گا باپو!"

ساتھ والے کمرے میں کھڑی کشور اُداس ہو کر رہ گئی۔

"کیوں بیٹے!" غفور نے بڑے پیار سے پوچھا۔

"میرے تین بڑے بھائی ہیں باپو! پہلے ان کی شادی ہو گی پھر میں شادی کروں گا۔"

"تمہیں کشور سے شادی پر کوئی اعتراض تو نہیں۔"

سلیم کا سر جھک گیا۔

"نہیں۔"

"تو پھر تم دونوں کا آج ہی نکاح ہو گا۔"

"بھائی کیا سوچیں گے باپو!"

"وہ کچھ نہیں کہیں گے۔ میں اُن کی شادی کا بھی بندوبست کر رہا ہوں یہ میرا فیصلہ ہے۔ تم جانتے ہو کشور کی امی اُسے لینے آئی ہے لوگ باتیں کرتے

ہیں کہ کیوں لڑکی کو یہاں بٹھا رکھا ہے ۔ میں اسے اس گھر سے جانے نہیں دینا چاہتا ۔ کیا اب بھی تمہیں کوئی اعتراض ہے "۔

سلیم اُٹھ کر ساتھ والے کمرے کی طرف چلا گیا ۔

" مجھے کوئی اعتراض نہیں باپو !"

غفور خوش ہو گیا ۔ باورچی خانے میں کشور کی امی اور گلشن بھی مسکرا رہی تھیں ۔ کشور کے ہونٹوں پر بھی پھولوں کی سی مسکراہٹ تھی ۔

سلیم جب ساتھ والے کمرے میں داخل ہوا تو کشور بھاگ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی اور اونچے اونچے سانس لینے لگی ۔

غفور اُٹھ کر باہر نکل گیا ۔

" میں مولوی صاحب اور دو چار آدمی بلا لاؤں "۔

سلیم ساتھ والے کمرے میں داخل ہوا ۔ کشور اس کی طرف پشت کیے اُونچے اُونچے سانس لے رہی تھی ۔ سلیم نے اس کا کان پکڑ لیا ۔

" یہ تم نے کیا چکر چلایا ہے ۔

کشور نے بڑی مشکل سے اپنی سانسوں پر قابو پایا اور منہ اس کی طرف کر لیا ۔

" کون سا چکر "

سلیم نے دیکھا اس وقت وہ بے حد خوب صورت دکھائی دے رہی تھی ۔

" یہی شادی کا چکر "۔

آنکھیں جھپکاتے ہوئے کشور نے بڑی معصومیت سے کہا ۔

" مجھے تو کوئی علم نہیں "۔

" تمہاری مرضی کے بغیر کیسے یہ شادی ہو سکتی ہے "۔

کشور اپنا کان چھڑا کر باہر بھاگ گئی ۔

" میں کیا جانوں "۔

شام سے پہلے ہی سلیم اور کشور کا نکاح ہو گیا ۔



(٦)

سلیم گھوڑی کی لگام پکڑے گھر داخل ہوا۔ ناند پہ اسے باندھنے کے بعد اس نے کشور کو زور سے آواز دی۔

"بھابی!"

صحن میں بیٹھی ہوئی گلشن نے ذرا غصے میں اسے کہا۔

"بھابی ہے وہ تمہاری، بیوی ہے اب۔"

غفور جو تخت پوش پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا مسکرا دیا تھا۔

سلیم نے بڑے پیارے انداز میں منہ پہ انگلی رکھ لی۔

"تھو میری ماں۔ وہ ——— ذرا پرانی عادت ہے نا۔"

گلشن بھی ہنس دی۔

"اب ختم کرو یہ عادت۔"

"جی بس ختم ہی سمجھیں۔" اس نے پھر کشور کو پکارا۔

"کشور!"

وہ کمرے سے جلدی جلدی نکل کر باہر آئی۔

"جی۔"

"ذرا کھریرا لانا۔"

کشور کھریرا لے کر جب اس کے پاس گئی تو سلیم نے بڑی رازداری اور پیار سے پوچھا۔

"پہلی آواز پر تم کیوں نہیں آئی تھی۔"

کشور کے ہونٹوں پہ تابناک مسکراہٹ تھی۔

"پہلی آواز مجھے تھوڑی ہی دی تھی۔ تم نے تو بھابی کو بلایا تھا اور جو تمہاری بھابی ہے آ جائے گی۔"

سلیم مسکرا کر خاموش ہو گیا اور گھوڑی کو کھریرا کرنے لگا۔

اتنے میں حویلی کے دروازے پہ کسی نے دستک دی اور سلیم کھریرا زمین پر رکھ کر باہر نکل گیا۔ کافی دیر تک وہ باہر کسی سے باتیں کرتا رہا۔ پھر اندر آیا اور ہولے سے کشور سے کہا۔

"اندر جا کر میرا لنگوٹا لے آؤ۔"

"کبڈی کھیلنے جانا ہو گا۔"

"ہاں۔"

"اب مَیں ایسے چوروں کی طرح نہ جانے دیا کروں گی۔ پہلے باپو سے اجازت لو پھر جاؤ گے۔"

"وہ نہیں جانے دیتے ناراض ہوتے ہیں۔"

"نہیں ناراض ہوتے تم پوچھو جاکر۔"

"اس کا مطلب ہے تم میری بے عزتی پر خوش ہو۔"

"ہرگز نہیں۔"

"پھر لادو میرا لنگوٹا۔"

"اوں ہوں، پہلے باپو سے اجازت لو۔"

سلیم نے پیشانی پہ ہاتھ مارا۔

"اوہو! شادی کیا ہوئی، تم تو میرا گورنر بن گئی ہو۔"

سلیم ماں کے پاس آیا۔ اور لاڈلے انداز میں پوچھا۔

"ماں! مَیں نے کبڈی کھیلنے جانا ہے۔"

گلشن نے سمجھایا۔

"چھوڑو بیٹا! جھگڑا ہو جاتا ہے۔"

سلیم گلشن کے پاؤں دبانے لگا۔

"اچھی ماں! نہیں، مَیں جھگڑا نہیں کروں گا۔ کہہ دو نا جاؤں۔"

گلشن مسکرا دی اور اپنے پاؤں سمیٹ لیے۔

"تو میرے پاؤں کیوں دباتے ہو جاؤ باپو سے پوچھ لو۔"

"میری نہیں مانیں گے ماں! تم خود ہی پوچھ لو نا۔"

"تم جاکر کہو تو سہی، مَیں تمہاری سفارش کر دوں گی۔"

سلیم برآمدے میں آیا۔ سامنے کمرے کے اندر دروازے کے پاس کشور کھڑی اس کی حالت دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ سلیم کا حوصلہ نہیں پڑ رہا تھا کہ وہ باپو سے جاکر پوچھے۔ وہ ذرا دور ہی برآمدے میں کھڑا ہو کر ٹکر ٹکر باپو کی طرف دیکھنے لگ گیا۔

کشور اس کی اس حالت پہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ سلیم نے بڑی بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔ منہ پہ دوپٹے کا پلّو رکھ کر ہنستے ہوئے کشور نے اسے ہاتھ کے اشارے سے باپو کی طرف جانے کو کہا۔

سلیم نے ایک بار کشور کو دیکھا پھر چند لمحوں تک غور سے باپو کو گھورنے کے بعد اپنے ماتھے پر منت کرنے کے انداز میں ہاتھ رکھتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس نے کشور کو اشارہ کیا کہ وہ پوچھ دے۔

کشور نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے پھر باپو کی طرف اشارہ کیا۔

سلیم نے اس بار مسخروں کے انداز میں اپنی ٹھوڑی پکڑتے ہوئے پھر کشور کی منت کی اور ہاتھ کے اشارے سے باپو کی طرف جانے کو بھی کہا۔

کشور اس کی اس حرکت پہ اس قدر ہنسی کہ دوہری ہو کر پیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ پیچھے ہٹ گئی۔

سلیم آہستہ آہستہ باپو کے پاس آیا اور ڈرتے ڈرتے کہا۔

"باپو! مَیں نے ذرا کبڈی کھیلنے کے لیے جانا ہے۔"

غفور نے بڑے پیار سے کہا۔

"چھوڑو بیٹا! اکثر ایسے موقعوں پر جھگڑا ہو جاتا ہے"۔

سلیم وہیں فرش پر بیٹھ گیا اور باپو کی ٹانگیں دبانے لگا۔

"جانے دو نا باپو!"

غفور نے تیز نگاہوں سے گھورا۔

"ضد کرتے ہو نا۔"

سلیم منہ بسورنے لگا۔

"لڑکے مجھے طعنہ دیتے ہیں باپو!"

"کیا کہتے ہیں؟"

"کہتے ہیں سلیم کی شادی ہو گئی ہے۔ اب وہ کبڈی نہیں کھیل سکتا۔"

غفور نے مسکرا کر پوچھا۔

"کون کہتا ہے؟"

"سب ہی کہتے ہیں وہ وہ

"جون پور کا رحمٰن جندرہ (تالہ) اور رحمت موٹا۔

خود لتھی کا رشید ٹلی (گھنٹی) اور فرزند طوطا۔

جگی کوٹ کا طفیل ٹلو

کچاں والی کا منظور حبیب جھبٹو (زبان دراز)

مرالہ کا محبوب گپّی — اور

چمرا کا بشیرا گوپ سب ہی طعنہ دیتے ہیں باپو!"

غفور نے اس بار ذرا نرمی سے پوچھا۔

"تو تم ضرور کبڈی کھیلنا چاہتے ہو۔"

سلیم اور زور سے باپو کی ٹانگیں دبانے لگا۔

"ہاں تو باپو!"

غفور نے حقہ ایک طرف کر دیا اور کھڑا ہو گیا۔

"چلو پھر میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ آج دیکھتا ہوں تم کیسی کبڈی کھیلتے ہو۔"

سلیم بھاگتا ہوا اندر چلا گیا۔

"ٹھہرو باپو! میں لنگوٹا لے آؤں۔"

سلیم اندر آیا اور کشور سے کہا۔

"اب تو میرا لنگوٹا لاؤ نا کشور۔"

کشور اس کے قریب آئی۔ لنگوٹا پہلے ہی اس کے ہاتھ میں تھا۔ سلیم کا ناک پکڑ کر اس نے زور سے ہلایا۔

"باپو سے کیا کہہ رہے تھے؟"

سلیم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"کیا کہا میں نے؟"

"یہی کہ لوگ کہتے ہیں سلیم کی شادی ہو گئی ہے اب وہ کبڈی نہیں کھیل سکتا۔ باپو اور ماں کیا سوچتے ہوں گے۔"

"ارے واہ، سوچنا کیا ہے وہ تو ہنس رہے تھے۔"

کشور نے اس کا ناک چھوڑ دیا۔

"شریر !"

"چلو دد نا لنگوٹا میں جاؤں ۔"

"ٹھہرو ۔" وہ ساتھ والے کمرے میں گئی اور چینی کا ایک پیالہ اٹھا لائی ۔ وہ مکھن سے بھرا ہوا تھا اوپر شکر بھی ڈالی ہوئی تھی اور ساتھ ایک چمچہ بھی تھا ۔ وہ اس نے سلیم کی طرف بڑھا دیا ۔

"یہ کھالو پہلے ۔"

سلیم وہیں کھڑے کھڑے کھانے لگا تو کشور نے چمچہ پکڑ لیا اور میز کی طرف اشارہ کیا ۔ "وہاں بیٹھ کر آرام سے کھاؤ ۔ اتنی جلدی کیا ہے ۔"

باہر سے غفور نے آواز دی ۔

"آؤنا سلیم !"

چمچہ منہ سے نکالتے ہوئے بڑی مشکل سے اس نے کہا ۔

"بس آیا باپو !"

گلشن نے بھی آواز دی ۔

"کشور ! مکھن دینا سلیم کو ۔"

غفور نے بھی تائید کی ۔

"ہاں ہاں دو بیٹی !"

اندر سے کشور کی آواز آئی ۔

"کھلا رہی ہوں ماں !"

سلیم نے پیالہ ختم کر کے کشور کو تھما دیا ۔

"اور دوں ؟" کشور نے بڑے پیار سے پوچھا ۔

سلیم کھڑا ہو گیا ۔

"بس ۔"

"کھالو نا ۔"

"اتنا ہی کافی ہے ۔"

"میں بھی تمہاری کبڈی دیکھوں گی ۔"

"تم کیسے دیکھو گی ۔ وہاں لڑکیاں تھوڑا ہی جاتی ہیں ۔"

"وہیں فتح محمد کی زمین میں ہو رہی ہے نا ۔"

"ہاں !"

"تو پھر میں اپنی چھت پہ بیٹھ کر دیکھوں گی ۔"

"ٹھیک ہے ۔"

کشور سے لنگوٹا لے کر وہ صحن میں آیا اور باپو کے ساتھ باہر نکل گیا ۔



(۷)

میدان میں تین ڈھول زور زور سے بج رہے تھے۔ اِرد گِرد کے اٹھارہ بیس گاؤں کے اَن گِنت لوگ وہاں جمع ہو گئے تھے۔ میدان کے وسط میں مٹی کے دو بڑے ڈھیر لگا دیئے گئے تھے۔ کبڈی کھیلنے والے لڑکے خوب تیل مل رہے تھے۔ غفور بھی مٹی کے ڈھیر کے قریب آکر بیٹھ گیا تھا اور سلیم تیل مل رہا تھا۔

دونوں ٹیمیں میدان میں اُتریں۔ آدم پور اور خود لتھی کے دو چودھری جج مقرر کر دیئے گئے تھے۔ سب سے پہلے جون پور کا رحمت موٹا کبڈی آیا۔ سگر کا ایک جوان اس کے سامنے آیا۔ دونوں تھوڑی دیر تک ایک دوسرے کو خوب طمانچے برساتے رہے۔ سگر والے نے اسے پکڑنے کی پوری کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا اور رحمت موٹا جیت کر نکل گیا۔ ڈھول پہلے کی نسبت زور سے بجنے لگے تھے۔ سگر کا وہی لڑکا جو رحمت کو پکڑ

نہ سکا تھا مٹی کے ڈھیر کے پاس آکر بیٹھ گیا۔

اب سلیم کبڈی گیا۔ اس کے سامنے جون پور کا رحمٰن جندرہ آکھڑا ہوا تھا۔ غفور نے اپنے قریب ہی بیٹھے ہوئے ایک بوڑھے سے پوچھا۔

"یہ کون سامنے آیا ہے سلیم کے؟"

"یہ رحمٰن جندرہ ہے" اس نے جواب دیا۔ "قینچی ایسی مارتا ہے کہ بالکل بے بس کر کے رکھ دیتا ہے۔ بڑی سُتھری کبڈی کھیلتا ہے۔ پر تیرا پوتا تیز ہے اس سے بڑی پیاری کبڈی کھیلتا ہے۔"

غفور نے خوش ہو کر کہا۔

"اچھا، مَیں نے تو اسے کبھی کھیلتے نہیں دیکھا۔ نہ جانے کیسی کھیلتا ہے۔"

"بہت اچھی کھیلتا ہے۔ مچھر ہے مچھر"

غفور خاموش ہو گیا۔ کیونکہ سلیم اور رحمٰن جندرہ ایک دوسرے پر تابڑ توڑ طمانچے برسا رہے تھے۔ تھوڑی دیر تک جم کر وہ ایک دوسرے کو مارتے رہے۔ پھر رحمٰن اسے قینچی مارنے کی کوشش کرنے لگا اور سلیم اس سے بچ کر بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ایک بار سلیم نے اُلٹے پاؤں بھاگتے ہوئے بھاگنا چاہا مگر رحمٰن چھاتی تان کر سامنے آکھڑا ہوا۔ سلیم پھر سیدھا کھڑا ہو گیا اور اسے چکمہ دے کر بائیں طرف سے بھاگ نکلا مگر رحمٰن بھی اس کے پیچھے بھاگا اور اُسے جا لیا۔

عین اس وقت جب کہ رحمٰن بھاگتے ہوئے سلیم کو قینچی مارنا چاہتا تھا سلیم نے اپنے دائیں پاؤں سے ٹھوکر لگائی اور ساتھ ہی اپنا دایاں بازو

پوری قوت سے اس کی گردن پر دے مارا۔ رحمٰن دو تین قلابازیاں کھا کر دُ
جا گرا۔ سلیم نے نعرہ مارا اور دوسری طرف نکل گیا۔ ڈھول زور زور
بجنے لگے تھے اور سگر کے لوگ اُٹھ کر ناچنے اور کپڑے ہوا میں اُچھالنے
تھے۔ چھت پر بیٹھی ہوئی کشور اور گلشن بھی خوش ہو رہی تھیں۔

دوسری طرف سے اب فرزند طوطا کبڈی آیا چاندی کوٹ کے ایک لڑ
نے اسے پکڑنا چاہا مگر وہ بڑی چابکدستی کے ساتھ اپنا آپ بچا کر نکل گیا۔ سلیم
طرف سے در کبڈی کا نذر ڈوگر گیا اور وہ بھی جیت آیا۔

اس طرح آخر میں ایک طرف سلیم اور نذر ڈوگر اور دوسری طرف رحم
موٹا اور فرزند طوطا رہ گئے تھے۔ آخری جھٹکوں پر آ کر کبڈی سخت ہو گئی تھی
کوئی بیتاب تھا کہ دیکھیں کون جیتتا ہے۔

دوسری طرف سے رحمت موٹا کبڈی آیا۔ نذر ڈوگر اس کے سامنے آیا
تھوڑی دیر کی جدوجہد کے بعد اس نے رحمت کو گرا لیا اور اس پر سوار ہو گیا
سلیم کبڈی گیا۔ یہ آخری کبڈی تھی۔ فرزند طوطا اور وہ ایک دوسرے کو تھوڑ
دیر تک خوب مارتے رہے۔ سلیم بھاگنا چاہتا تھا مگر فرزند اسے ہر سمت
روکے ہوئے تھا۔ سلیم نے اپنا آخری حربہ استعمال کیا اور ایک طرف سے نکلنے
کوشش کرتے ہوئے اس نے فرزند کے دونوں بازو بھاگتے ہوئے پکڑے اور
خود نیچے جھک کر اس نے فرزند کو اپنے اُوپر سے لہراتے ہوئے دور پھینک
سلیم بھی گر گیا تاہم جب وہ جلدی جلدی اُٹھ کر بھاگنے لگا
اس کے پاؤں میں کانٹا چبھ گیا۔ فرزند بھی اتنی دیر تک اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس

سلیم کو پکڑنے کی پوری کوشش کی مگر سلیم لنگڑاتا ہوا کسی نہ کسی طرح اس سمت
پہنچ گیا اور زمین پر بیٹھ کر پاؤں دیکھنے لگا۔ چھت پر بیٹھی کشور اور گلشن پریشان ہو
گئی تھی۔

کافی لوگ اس کے اِرد گرد جمع ہو گئے تھے۔ جیتنے والے گاؤں کے لوگ
نعرے لگا لگا کر اپنی پگڑیاں اور چادریں ہوا میں اُچھال رہے تھے۔ غفور بھی سلیم
کے پاس بیٹھا ہوا اس کا پاؤں دیکھ رہا تھا۔

لوگ اِدھر اُدھر چھٹنے لگے۔ سلیم نے بھی اُٹھ کر کپڑے پہنے اور باپو کے
ساتھ گھر کی طرف چل دیا۔ ابھی وہ گلی میں ہی آئے تھے کہ کشور گھر سے بھاگتی ہوئی باہر
آئی اور گھبرائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"کیا ہوا سلیم!"

اسی وقت گلشن بھی باہر آ گئی اور پریشانی سے پوچھا۔

"کیا ہوا بیٹے!"

سلیم مسکرا دیا۔

"پاؤں میں کانٹا چبھ گیا ہے ماں!"

کشور آگے بڑھی اور اپنے دوپٹے سے سلیم کی پیشانی سے پسینہ صاف کیا۔

"چلو اندر۔"

سلیم کا بازو پکڑ کر وہ اندر لائی اور پھر جلدی جلدی سامنے والے کمرے
سے جا کر سوئی لے آئی اور سلیم کا بازو پکڑ کر بٹھایا۔

"بیٹھو، کانٹا نکال دوں۔"

سلیم چارپائی پر بیٹھ گیا۔ کشور اس کے سامنے زمین پر ہو بیٹھی اور اپنے گھٹنے پر اس کا پاؤں رکھ کر سوئی سے کانٹا نکالنے لگی۔

ایک موقع پر جب کہ کشور نے سوئی سے کانٹا ہلایا۔ سلیم نے اپنا پاؤں پکڑ لیا۔

"او۔ ہو، یہ کانٹا نکال رہی ہو یا سوئی چبھو رہی ہو۔"

کشور مسکرا دی اور پھر کانٹا نکالنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد سلیم کو جب پھر تکلیف ہوئی تو اس نے اپنا پاؤں سمیٹ لیا۔ "ایسے تھوڑا ہی کانٹا نکالا جاتا ہے۔" اس نے ماں کو آواز دی۔

"ماں! خود کانٹا نکالنا آ کر۔ کشور درد کر رہی ہے۔"

گلشن ان کے پاس آ کھڑی ہوئی اور مسکرا کر کشور سے پوچھا۔

"کیا بات ہے۔"

کشور نے سلیم کا پاؤں پکڑ کر پھر اپنے گھٹنے پر رکھ لیا۔

"بیری کا ٹیڑھا کانٹا ہے ماں! سوئی سے ہلا ہلا کر نکالنا پڑ رہا ہے۔ یہ تو ایسے ہی ناراض ہونے لگ جاتا ہے۔ ادھر دیکھو تو آ کر۔"

گلشن آگے بڑھ کر کانٹا دیکھنے لگی اور کشور منہ بسور بسور کر سلیم کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ سلیم اس کی اس ادا پر مسکرا دیا تھا۔ گلشن نے بھی کشور کی تائید کر دی۔

"کانٹا واقعی ٹیڑھا ہے بیٹے! ورنہ کشور تو کانٹا ایسے نکال دیتی ہے جس طرح گھی سے بال کھینچ لیا جائے۔"

سلیم نے اپنے پاؤں کی ایڑی سے کشور کا گھٹنا ہلاتے ہوئے اسے کہا۔

"اچھا نکالو۔"

تھوڑی دیر کی کوشش کے بعد کشور نے کانٹا نکال کر سلیم کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ "دیکھو تو کیسا ٹیڑھا کانٹا ہے۔"

سلیم کانٹا دیکھنے لگا۔

کشور نے اس کے پاؤں پر ہاتھ مارا۔

"چلو اٹھو اب، آج سے تمہارا گھی اور مکھن دگنا ہو گیا ہے۔"

سلیم نے تجسس سے پوچھا۔

"وہ کس خوشی میں۔"

کشور کی آواز میں دور دور تک پیار اور چاہت ہی چاہت تھی۔

"آج تم نے کبڈی جو اچھی کھیلی ہے۔"

گلشن نے بھی اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

"آج تم واقعی بہت اچھے کھیلے ہو بیٹا! سب لوگ تعریف کر رہے تھے۔ چلو اب اٹھ کر نہا لو۔"

سلیم کھڑا ہو گیا۔

کشور پھر بولی۔

"ٹھہرو! میں دھوتی لا دیتی ہوں۔ باندھ کر یہیں نل پر ہی نہا لو۔ کیا ضرورت ہے کنوئیں پر جانے کی۔"

سلیم دھوتی باندھ کر باہر آیا۔ کشور نلکا چلانے لگی اور وہ نیچے بیٹھ کر

نہلانے لگا۔



(۸)

انصاف ہار گیا تھا۔

قانون مجرموں کو اپنی گرفت میں نہ لے سکا تھا۔

عدالت کے ترازو میں چوہدری حاکم نے دولت ڈال کر اپنی طرف
لیا تھا اور اس کے وہ سب آدمی جنہوں نے نصیر کو قتل کیا تھا بری ہو گئے

سلیم کا دل ٹوٹ گیا تھا وہ تو اس امید پر بیٹھا ہوا تھا کہ قانون
انصاف کرے گا مگر ایسا نہ ہوا اور قانون کے گرد دولت کی مضبوط گرفت
اسے اپنا رُخ بدلنے پر مجبور کر دیا تھا۔

سلیم ایک روز ہل چلا رہا تھا کہ چوہدری حاکم کے وہی آدمی ج
نے نصیر کو قتل کیا تھا آئے اور سلیم کے بیلوں کے سامنے کھڑے ہو کر ا

روک دیا۔

سلیم نے ہل زمین سے نکال کر پاؤں سے جھاڑی اور پھر ایک طرف جھکاتے
ہوئے وہ ان کے قریب آیا اور پریشانی سے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

ان میں سے ایک جو ان کا سرکردہ تھا بولا۔

"چوہدری کا حکم ہے کہ تمہارا ہل روک دی جائے۔"

"پر کیوں؟"

"کیوں جھگڑے کی ابتدا ہوتی ہے۔ بس آج کے بعد تم اپنی زمینوں میں
ہل نہیں چلاؤ گے۔"

سلیم نے پھر نرمی سے جواب دیا۔

"یہ میری اپنی زمین ہے۔ میں چوہدری حاکم کے کھیت نہیں جوتتا۔ ہر
شخص کو اپنی زمین جوتنے کا حق ہے۔"

"مگر ہم تم سے یہ حق چھین لیں گے۔"

سلیم نے پھر ہل تھام لی اور بیلوں کو ہانکتے ہوئے کہا۔

"تم لوگ تو جھگڑا کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ مجھ میں جھگڑا کرنے کی ہمت
نہیں۔ غریب آدمی ہوں۔ بھائی کے قتل نے پہلے ہی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔
میں ایک پُرامن شہری کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ تم لوگ سامنے سے ہٹ
جاؤ اور مجھے اپنا کام کرنے دو۔"

انہوں نے سلیم کے بیلوں کی رسیاں پکڑ لیں۔

"تم ہل نہیں چلاؤ گے"۔

سلیم نے پھر نرمی سے ہی جواب دیا۔

"ہل نہ چلاؤں تو بھوکا مروں"۔

"بھوکے مرو یا جہنم میں جاؤ۔ بس تم زمین سے بیل باہر نکال لو"۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

اس نے غصے میں کہا۔

"تم خود نکالو گے"۔

"میرا نام بھی سلیم ہے میں اپنی زمین ضرور جوتوں گا چاہے جان ہی کیوں نہ چلی جائے"۔

"اچھا دیکھتا ہوں"۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"پکڑ لو اسے"۔

"سب مل کر اسے مارنے لگے۔ سلیم نے آگے سے ہاتھ نہ اٹھایا تھا اسی وقت کشور اس کے لیے کھانا لے کر آ رہی تھی اس نے جو سلیم کو پٹتے دیکھا تو بچاری سر پہ کھانا اٹھائے اس کی طرف بھاگنے لگی۔

انہوں نے بے گناہ سلیم کو اتنا مارا اتنا مارا کہ اس کے منہ اور پیشانی سے خون بہہ نکلا۔ جب وہ مار کھا کر گر گیا تو اس نے پھر پوچھا۔

سلیم نے اپنے منہ سے خون پونچھتے ہوئے کہا۔

"میرا جواب نہیں میں ہی ہے چوہدری! میرا ہل اس وقت ہی رکے گا جب تم لوگ مجھے جان سے مار ڈالو گے"۔

"خیر ہم یہ بھی کر گزریں گے۔ یہ پہلی تنبیہہ ہے۔ ہم دو دن تک تمہارے فیصلے کا انتظار کریں گے پھر اس سے بھی سخت قدم اٹھائیں گے"۔

سلیم خاموش رہا اور وہ چلے گئے۔

اتنے میں کشور آ گئی۔ کھانا زمین پر رکھتے ہوئے وہ بھاگتی ہوئی آگے بڑھی اور سلیم کے پاس بیٹھتے ہوئے اپنے دوپٹے کے پلو سے اس کی پیشانی اور منہ صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں جھگڑا ہوا" وہ رو بھی رہی تھی۔

"ہل روکتے تھے"۔

"کشور سسک دی"

"کیوں؟"

"کہتے ہیں آج کے بعد تم اپنی زمینوں میں ہل نہیں چلایا کرو گے۔ میں مر جاؤں گا پر ایسا نہ ہونے دوں گا"۔ "یہ ظلم ہے"۔

"سراسر ناانصافی ہے"۔

"قانون نے ان بھیڑیوں کو کھلا چھوڑ رکھا ہے"۔

"کوئی انہیں پوچھنے والا نہیں"

سلیم کی آواز ڈوب گئی۔

"یہ کہاں کا انصاف ہے۔ بھائی بھی قتل ہو گیا اور اس کی پاداش میں ہم اپنی زمین بھی چھوڑ دیں اور یہ قاتل کھلے عام پھرتے رہیں۔ نہ جانے کیا زمانہ آ گیا ہے"۔

کشور ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔

سلیم نے اس کا شانہ پکڑ کر ہلایا۔

"تم کیوں رو رہی ہو؟"

کشور نے اپنے آنسو پونچھے اور ہچکیوں میں کہا۔

"اٹھو کھانا کھالو۔"

سلیم اُٹھ کر اپنی زمین کے کنارے آ بیٹھا۔ کشور ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی اور اس کے سامنے کھانا بھی لگا رہی تھی۔ اتنے میں ایک طرف سے ایک گھوڑ سوار اپنا گھوڑا سرپٹ دوڑاتا ہوا آیا اور ان کے پاس آ رکا اور گھوڑے سے اُترتے ہوئے اس نے بڑی نرمی سے پوچھا۔

"پیاس لگی ہے میرے بھائی پانی مِل جائے گا۔"

سلیم نے مٹلیا میں سے اُسے لسی کا پیالہ بھر کر دیا۔

اس نے لسی پی اور پیالہ واپس کرتے ہوئے ہمدردی سے پوچھا۔

"یہ تمہارے خون نکل رہا ہے کسی سے جھگڑا ہوا ہے۔"

سلیم کوئی جواب دینے والا تھا کہ اس نے کشور کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تم کیوں رو رہی ہو بہن!"

کشور نے ہچکیوں میں کہا۔

"ہم غریبوں کے مقدر میں رونے کے علاوہ ہے بھی کیا۔"

"جھگڑا ہوا کسی سے۔"

"چوہدری حاکم کے آدمی زمین نہیں جوتنے دیتے۔ جب کہ زمین بھ

ہے۔ ابھی ابھی جھگڑا کر کے گئے ہیں اور ان کو مار پیٹ کر چلے گئے ہیں۔"

اس نے سلیم پوچھا۔

"کتنے آدمی تھے۔"

"پانچ"

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"سلیم۔"

"اس نصیر کے بھائی ہو جو قتل ہو گیا تھا۔"

"ہاں۔"

"تو پھر تم بزدل ہو۔ اپنی جوانی اور قدبت دیکھو، تم ایک ایک ہاتھ ن سالوں کو مارتے تو ان کے جبڑے توڑ کر رکھ دیتے۔"

سلیم نے ذرا غصے میں کہا۔

"بزدل نہیں۔ مَیں جھگڑوں میں نہیں پڑنا چاہتا۔ زندگی کے چار دن انسان ن سکون اور آشتی کے ساتھ گزارنا چاہیئے۔"

اس نے طنزیہ کہا۔

"ایسی باتیں ایک بزدل انسان ہی سوچ سکتا ہے۔"

سلیم غصے میں کھڑا ہو گیا۔

"تم بکواس کرتے ہو۔ مَیں بزدل نہیں۔ ذرا اِدھر آؤ۔" اس نے اپنی جُتی ِمین کی طرف اشارہ کیا۔ "اور مجھ سے قوت آزمائی کر لو مَیں ثابت کر دوں یں بزدل نہیں۔"

وہ آگے بڑھ آیا اور مسکرا کر کہا۔

"واہ! یہ بھی خوب رہی۔ میرا بھی خون گرم ہو جائے گا۔"

کشور اُٹھ کر سلیم سے لپٹ گئی۔

"ہم نہیں لڑنے کسی سے۔ بیٹھو کھانا کھاؤ۔ جاؤ میرے بھائی! تم کام کرو جا کر۔"

سلیم نے کشور کو ایک طرف ہٹا دیا۔

"ذرا ٹھہرو کشور! مَیں اسے اگر لوہے کے چنے نہ چبا دوں تو کسان بیٹا نہیں۔"

دونوں ایک دوسرے پر پل پڑے، خوب مار رہے تھے۔ کشور بچا پریشان کھڑی تھی۔ اجنبی بڑا تیز دکھائی دے رہا تھا۔ تین مکّے اس نے سلیم کو لگا مار کر نیچے گرا دیا اور اس پر سوار ہو گیا۔ سلیم نے اس کے پیٹ میں پاؤں د اُوپر اُٹھایا اور پھر اس کی گردن اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اس زور سے جھ دیا کہ وہ اس کے سر سے لہراتا ہوا نیچے آگرا۔

سلیم پھُرتی سے اُٹھا اور اس پر مکّوں کی بارش کر دی۔ اجنبی اچانک اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اس زور سے دبایا کہ سلیم کو اپنا بند ہوتا محسوس ہوا۔ اس کی گردن بھی پھُول گئی تھی اور آنکھوں کے سا تارے ناچ اُٹھے تھے۔

تاہم اس نے ہمت نہ ہاری اور دایاں گھٹنا پوری قوت سے اس پیٹ میں دے مارا۔ وہ بلبلا کر پیچھے ہٹا اور اسی لمحہ سلیم نے اس کے جب

سر اور گردن پر سخت مکّے لگائے۔ اجنبی تیورا کر گر گیا۔ سلیم اس پر سوار ہو گیا اور اس کی چھاتی پر گھٹنا رکھتے ہوئے پوچھا۔

"اب بتاؤ مَیں بزدل ہوں۔"

لمبے لمبے سانسوں میں اس نے کہا۔

"نہیں"

سلیم نے اُسے چھوڑ دیا۔

وہ کھڑا ہو گیا۔

سلیم اب مسکرا رہا تھا۔

"آؤ اب کھانا کھاؤ۔"

وہ بھی مسکرا دیا۔

"عجیب انسان ہو۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"نواب"

"آدم پور کے ہو؟"

"ہاں۔"

"تم مفرور تو نہیں؟"

"ہاں اشتہاری مجرم ہوں۔ مَیں نے قسم کھا رکھی ہے کہ غریبوں پر ظلم کرنے والوں کو چن چن کر قتل کر دوں گا۔"

"مگر تم قاتل کیسے بن گئے"

نواب نے طویل سانس لیا۔

"دُکھ بھری کہانی ہے ایک"۔

"سناؤ تو سہی"۔

"مَیں قوم کا ترکھان ہوں۔ پچھلے سموں میں جب ووٹنگ ہوئی تھی تو مَیں نے اپنے چوہدری کی خواہش کے خلاف اپنی مرضی کے مطابق بہتر شخص کو ووٹ دیا۔ چوہدری اس پر ناراض ہو گیا اور میرا گاؤں میں کام کرنا بند کرا دیا"۔

ناچار مَیں شہر جا کر محنت مزدوری کرنے لگا۔ مگر اس ظالم چوہدری نے میری غیر موجودگی میں میری بوڑھی ماں اور بیوی کو گھر سے نکالنا چاہا۔ جب انہوں نے انکار کر دیا تو اس بھیڑیے نے انہیں اتنا مارا کہ وہ دونوں مر گئیں۔

نواب جذباتی ہو گیا۔

یہ سرمایہ دار اور جاگیردار اپنے آپ کو خدا سمجھتے ہیں میرے بھائی! مجھے جو نہی اس واقعہ کی اطلاع ملی تو مَیں گاؤں آیا اور چودھری، اس کے تین بیٹوں، ایک بیوی اور بیٹی کو اپنے کلہاڑے سے ختم کر دیا۔ تب سے مَیں نے قسم کھا رکھی ہے کہ اس علاقے میں جو شخص بھی غریبوں پر ظلم کرے گا مَیں اس سے انتقام لوں گا۔

وہ غصے میں اور بھڑک اُٹھا۔

یہ چوہدری، یہ وڈیرے، سرمایہ دار اور جاگیردار، چور ہیں۔ ڈاکو لٹیرے بھیڑیے اور آدم خور ہیں۔ مَیں ان کتوں کے پلّوں سے جینے کی آرزو چھین لوں گا۔ یہ بڑی بڑی توندوں والے جو کبھی میرا نام حقارت سے لیا کرتے تھے۔ اب میرے لیے اپنی اولاد کو ڈراتے ہیں، مَیں موت ہوں اُن کی"

"عذاب ہوں خدائے برتر کی جانب سے"

"مَیں اُنہیں بتاؤں گا کہ غریب کی آن جب سرِ عام نیلام کی جاتی ہے تو کیا رنگ دکھاتی ہے۔

یہ چور اُچکّے۔

یہ ننگ وطن اور قوم

یہ دولت کے پُجاری

یہ خون کے دیوتا

مَیں اُنہیں ادھیڑ دوں گا جس طرح بھیڑیا بکری کی کھال ادھیڑتا ہے۔

میں اُنہیں روئی کی طرح تُوم کر رکھ دوں گا۔

یہ ہم سے جینے کا حق چھینتے ہیں۔

ہمارے مُنہ سے لقمہ نِکال لیتے ہیں۔

یہ فرعون!

یہ نمرود

سلیم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

زیادہ جذباتی نہ ہو۔ ادھر آؤ۔

نواب اس کے ساتھ ہو لیا۔

اگر کہو تو چودھری کے جن چمچوں نے تمہارے ساتھ جھگڑا کیا ہے۔ پڑ جاؤں اُنہیں۔ ادھر دیکھو، اس نے اپنے گھوڑے کی طرف اشارہ کیا۔ میر میرے پاس ایک رائفل ہے جس میں دس گولیاں ہیں۔ ایک سٹین گن ہے۔

جس کی میگزین میں چھبیس گولیاں ہیں اور اس نے اپنے تہمد کا پلو ٹٹولا - اور یہ ریوالور
یہ سب ہتھیار میں نے ایسے ہی لوگوں کے لیے رکھے ہوئے ہیں -

سلیم نے اس کا شانہ تھپتھپایا -

"نہیں نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں" وہ

وہ اس کو ساتھ لے کر کھانے پر بیٹھ گیا اور دونوں کھانا کھانے لگے -



(٩)

بیلوں کو ہانکتا ہوا جب وہ گھر داخل ہوا تو اس کی پھٹی ہوئی پیشانی دیکھ کر گلشن پریشان ہو گئی - ہاتھ میں پکڑی ہوئی بالٹی اس نے وہیں رکھ دی اور پریشانی سے پوچھا -

"یہ چوٹ کیسے آئی بیٹا!"

سلیم تھوڑی دیر تک کچھ کہہ نہ سکا تھا - چہرے پر غم کی گہری چھاپ بھی لگ گئی تھی - غفور بھی قریب آیا اور بڑے اضطراب سے پوچھا -

"بولتے کیوں نہیں ہو بیٹا! کس سے جھگڑا ہوا؟"

سلیم کا سر جھکا ہوا تھا -

"جھگڑا نہیں ہوا بابو!"

"پھر کیا ہوا؟"

سلیم پھر خاموش ہو گیا۔ اندر کشور دروازے کے پیچھے کھڑی رو رہی تھی۔

غفور نے زور دے کر کہا۔

"کیسے آئی پھر چوٹ؟"

سلیم خاموشی کے ساتھ بیلوں کو علیحدہ کرنے لگا۔ کشور بھی جلدی جلدی باہر آئی اور بیلوں کی رسیاں پکڑ کر ناند پر باندھنے لگی۔ سلیم ہل پنجالی اٹھا کر ایک طرف رکھنے لگا تھا کہ گلشن نے اس کا چہرہ پکڑ کر اپنی طرف کیا۔

"بتاتے کیوں نہیں سلیم!"

"بیل نے سینگ مارا تھا ماں!"

"پر ہمارے بیل مارتے تو نہیں۔"

"میں اس کی لٹکی ہوئی رسی ٹھیک کرنے لگا تھا کہ اس نے اپنا سر زور سے اوپر اٹھایا۔ شاید مکھی لڑ گئی تھی اسے۔ اس طرح سینگ میری پیشانی پر لگ گیا اور زخم آ گیا۔"

"اور تم اداس اور غمگین بھی ہو۔"

"نہیں ماں"! وہ برآمدے کی طرف چلا گیا۔

بظاہر اس نے بہانہ بنا کر بات کو وقتی طور پر ٹال دیا تھا۔ مگر غفور اور گلشن کو اطمینان نہ ہوا تھا اور وہ کسی جستجو میں پڑ گئے تھے۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ کو سرخ طوفان پھر سے سر پر منڈلانے لگا ہے۔ سلیم بے شک اس طوفان کے آگے بند باندھ چکا تھا مگر ان کی تجربہ کار نگاہیں اندازہ لگا چکی تھیں کہ زخم بیل کا لگایا ہوا نہیں!

دو دن گزر گئے۔ سلیم چلچلاتی دھوپ میں ہل چلا رہا تھا۔ کشور اسے کھانا کھلا کر چلی گئی ہوئی تھی کہ چوہدری کے وہی آدمی غصے میں بولا۔

"ہم نے تمہیں کہا نہ تھا۔ ہل نہ جوتنا۔"

سلیم ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

"میں نے بھی کہا تھا کہ میں اپنی زمین ضرور جوتوں گا۔"

"تو اس مار سے تمہارا دماغ ٹھیک نہیں ہوا۔"

"دماغ تو پہلے ہی ٹھیک ہے چوہدری! پر تم لوگ ہی اسے خراب کر رہے ہو۔"

"تو تم باز نہیں آؤ گے۔"

"میں نے کہہ دیا تھا کہ یہ ہل اس وقت اس وقت ہی رکے گا جب میں خود ختم ہو جاؤں گا۔"

"دیکھتا ہوں کیسے نہیں رکتا تمہارا ہل۔ پکڑ لو اسے اور خوب گرم کرو۔"

اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا۔

وہ سارے بڑے بے رحمی اور بے دردی سے سلیم کو مارنے لگے۔

سلیم مار بھی کھا رہا تھا اور چلا بھی رہا تھا۔

"مارو، خوب مارو۔

عدالت اگر اندھی ہے۔

قانون کے ہاتھ اگر کٹ گئے ہیں۔

انصاف اگر اندھا ہو چکا ہے تو پرواہ نہیں۔

خدا دیکھ رہا ہے۔ وہ اپنی عدالت میں انصاف ضرور کرے گا۔ اس کا قانون تمہاری گردن تک ضرور پہنچے گا۔ انسان کا بنایا ہوا قانون اگر ایک غریب اور بے بس کی حفاظت نہیں کر سکتا تو نہ سہی میں حشر کے روز اپنے رب سے تو اس کی فریاد ضرور کروں گا۔

انہوں نے سلیم کو مار مار کر لہولہان کر دیا۔ وہ بے ہوش ہو کر گر گیا اور وہ بدمعاش اسے اسی حالت میں چھوڑ کر چلے گئے۔

کافی دیر بعد سلیم ہوش میں آیا۔ بڑی مشکل سے وہ کھڑا ہوا اور دو قدم چل کر پھر گر گیا۔ اس کی ٹانگیں جواب دے گئی تھیں اور سر چکرا گیا تھا۔ تھوڑی دیر سستا کر وہ پھر اٹھا۔ ہل نکال کر بڑی مشکل سے پنجالی پر رکھی اور پیچھے ہٹنا چاہتا تھا کہ پھر گر گیا۔

بیل چل پڑے تھے۔ ہل کا پچھلا حصہ جب سلیم کے پاس سے گزر رہا تھا تو اس نے اسے پکڑ لیا اور اپنا جسم اس پر گرا لیا۔ بیل اسے کھینچتے ہوئے گھر لے جانے لگے۔

بیل جب گھر داخل ہوئے تو سلیم ہل کا سہارا لیتا ہوا بڑی مشکل سے اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا بیلوں کے آگے آیا اور پنجالی پہ سر رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بیلوں کو جوئے میں سے نکالنا چاہتا تھا مگر نکال نہ سکا تھا۔

گلشن بھاگ کر اس کے پاس آئی اور اس کا سر اوپر اٹھا کر اس نے بڑی رقت آمیز آواز میں پوچھا۔

"کیا ہوا سلیم؟"

مگر اس نے جب سلیم کی حالت دیکھی تو خوف سے کانپ گئی۔ گھبرائی ہوئی اور کپکپاتی آواز میں اس نے کشور کو پکارا۔

"کشور باہر آنا جلدی جلدی۔ دیکھو سلیم کو کیا ہوا ہے۔"

کشور نے ان کی طرف بھاگتے ہوئے پوچھا۔

"کیا ہوا ماں!"

گلشن رو پڑی تھی۔

"دیکھو تو بیٹی! کیا ہوا ہے اسے۔"

کشور نے اسے سہارا دے کر پیچھے ہٹایا اور اس کے کپڑے اور منہ جھاڑتے ہوئے ڈوبتی آواز میں پوچھا۔

"چوہدری کے آدمیوں نے ہل روک دیا ہو گا۔"

سلیم نے سر ہلا دیا۔

غفور نے غصے میں پوچھا۔

"کس نے ہل روکا تمہارا۔"

سلیم کے بجائے کشور نے جواب دیا۔

"باپو! پچھلی دفعہ بھی بیل نے انہیں سینگ نہ مارا تھا بلکہ چودھری کے آدمیوں نے اسے مارا تھا اور دیکھو باپو! آج پھر انہوں نے مارا ہے۔ یہ کوئی حالت تو نہیں ہے نا باپو! اس سے تو بہتر ہے ہم مر جائیں۔"

کشور کھل کر رو دی تھی۔

غفور غصے میں باہر نکل گیا۔

"تم دونوں بیلوں کو باندھو اور سلیم کو سنبھالو۔ میں ابھی تھانے جا کر رپورٹ لکھواتا ہوں۔"

سلیم نے غفور کو زور سے پکارا۔

"رہنے دو بابو!"

کشور نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر آگے چلاتے ہوئے کہا۔

"جانے دو نا۔ اس طرح تو وہ روز ہی ہم سے جھگڑا کرتے رہیں گے"

غفور نے تھانے جانے کے لیے گاؤں کے قبرستان میں سے گزر رہا تو چودھری کے آدمیوں نے اس کا راستہ روک لیا اور ایک بدمعاش نے بڑی گستاخی سے پوچھا۔

"کدھر جا رہے ہو بڈھے!"

غفور نے اپنی لاٹھی ٹیکتے ہوئے خاموشی سے آگے بڑھ جانا چاہا۔

مگر اس کمینے اور پلید انسان نے بوڑھے غفور کا بازو پکڑ کر اس زور سے اپنی طرف کھینچا کہ وہ بیچارا تیورا کر گر گیا۔ لاٹھی اس کی دور جا پڑی اور گھٹنے اس کا تہبند پھٹ گیا۔

"میں پوچھتا ہوں کہاں جا رہے ہو"

اس بدمعاش نے گرے ہوئے غفور کا کندھا جھنجھوڑ کر پوچھا۔

بڑی ہی بے بسی سے غفور اُٹھا اور اپنی لاٹھی سنبھالتے ہوئے کہا

"تھانے جا رہا ہوں۔"

"کیوں؟"

"رپٹ لکھواؤں گا چودھری کے خلاف۔ دو بار میرے سلیم کو حیوانوں کی طرح مارا گیا ہے۔ کیا ہم انسان نہیں۔"

"کیا ہمیں جینے کا حق نہیں۔"

اس نے ریوالور نکال کر غفور کی چھاتی پر رکھ دیا۔

"یہیں سے واپس گھر لوٹ جاؤ۔ تھانے جانے کی اگر کوشش کی تو چھ گولیاں تمہارے سینے میں داغ کر یہیں دفن کر دوں گا۔"

غفور کھڑا ہو کر کچھ سوچنے لگا۔

اس ذلیل نے زور سے دھکا دے کر پھر بوڑھے غفور کو زمین پر گرا دیا۔

"جاؤ دفع ہوتے ہو اب یا جماؤں دو ہاتھ۔"

غفور اُٹھا اور واپس گاؤں کی طرف چل دیا۔

اپنے گھر جانے کے بجائے وہ چوہدری کے گھر داخل ہوا وہ اپنے بیٹوں اور بیوی کے ساتھ بیٹھک میں باتیں کر رہا تھا کہ غفور بھی اندر چلا گیا۔

چوہدری حاکم نے غصے سے پوچھا۔

"کدھر آئے ہو بڈھے!"

غفور نے بڑی عاجزی سے کہا۔

"ایک فریاد لے کر آیا ہوں چوہدری!"

بڑی رعونت سے چوہدری نے پوچھا۔

"کہو کیا کہتے ہو۔"

"میرے بیٹے پر کس وجہ سے دو بار ظلم کیا گیا۔"

"سلیم کی بات کرتے ہو؟"

"جی ہاں۔"

"اسے میرے آدمیوں نے کہا نہ تھا کہ زمین میں ہل نہ جوتے۔"

"پر ہم اپنی آبائی زمین کیسے چھوڑ دیں۔"

"چھوڑنا ہوگی تمہیں۔"

"زبردستی ہے یہ۔"

"ہاں ہماری مرضی یہی ہے۔"

"یہ ظلم ہے چوہدری!"

"جو کچھ بھی ہے بس ہمارا حکم ہے یہ۔"

غفور کو بھی غصہ آگیا تھا۔

"دکھ سکھ سب کے ساتھ لگا ہوا ہے چوہدری! غضب الٰہی اور آفت سماوی سے ڈرو۔ ہم لوگوں کی تو چرسا بھر ہے۔ وہ بھی ہم سے نکل گئی تو کدھر جائیں گے ہم"

"جہنم میں جاؤ"

غفور کی آواز بلند ہو گئی تھی۔

"ظالم کی رسّی دراز ہے مگر عمر کوتاہ ہے۔"

"بیٹے کی زندگی چاہتے ہو تو زمین جوتنا چھوڑ دو۔"

"زمین تو ہم نہیں چھوڑیں گے۔"

"تو پھر ہمارا ظلم اور بڑھے گا۔"

غفور کی بوڑھی چھاتی تن گئی۔

"ہمارا ہاتھ بھی پھر اُٹھے گا۔"

"کون اُٹھائے گا ہاتھ۔ میں وہ ہاتھ ہی کاٹ دوں گا۔"

"کمزور بلّی پر بھی اگر حد سے زیادہ ظلم کیا جائے تو وہ بھی اپنے دفاع پر اُتر آتی ہے۔ ہمارے ہاتھ کٹتے کٹتے کئی اور ہاتھ بھی کٹیں گے۔"

"تم حد سے بڑھ رہے ہو چوہدری! تم بے گناہوں پر ظلم کرتے ہو اور ان سے جینے کی آرزو چھینتے پھرتے ہو۔"

چوہدری زور سے گرجا۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

"میں فیصلہ کر کے جاؤں گا چوہدری!"

"کیسا فیصلہ۔"

"اپنے آدمیوں کو منع کرو کہ آئندہ ہمارا ہل نہ روکیں۔"

"روکیں گے۔"

"تو خون بھی بہے گا۔"

"کون بہائے گا خون؟"

"جس پر ظلم ہوگا۔ اگر یہ ظلم اور بڑھا تو سرخ خونی طوفان اُٹھ کھڑا ہوگا چوہدری! اور اس سے قبل کہ ہم دونوں کے گھر اس منحوس طوفان کی نذر ہو جائیں میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ ہمیں امن اور سکون سے جینے دو۔"

"تمہیں اس کی اجازت ہے کرو کیا کرتے ہو۔ میں نمٹ لوں گا تم سے

دیکھتا ہوں، تم کون سا سُرخ طوفان کھڑا کرتے ہو۔ میرا ظلم تم پر ایسے ہی رہے گا۔"

"ظلم کی یہ زنجیر آخر کب تک۔ ایک دن اسے ٹوٹنا ہوگا اور اس روز تمہاری اپنی ہنسی بھی نہ رہے گی اور تم پچھتاؤ گے کہ میں نے تمہیں ٹھیک ہی مشورہ دیا تھا۔"

چودھری حاکم نے اسے دھکا دے کر پیچھے گرا دیا۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ دُور ہو جاؤ میری حویلی سے۔"

غفور اُٹھا اور کپڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔

"تو پھر مجھے اپنے دوسرے بیٹوں کو بھی بُلانا ہوگا۔ مجھے بھی اپنے شیروں کو آواز دینا ہوگی۔"

"ضرور بلاؤ۔ دیکھتا ہوں تم سب مل کر کیا کرتے ہو۔"

غفور باہر نکلتے ہوئے بڑبڑایا۔

"ضرور بلاؤں گا چوہدری! ضرور، تمہارا گھر ہی نہیں یہ پورا گاؤں ہی خون میں نہا جائے گا۔"



(۱۰)

سلیم چارہ لے کر آیا تو ظفر، شبیر اور بشیر تینوں گھر آئے ہوئے تھے اور غفور، گلشن، منشی امین اور ماسٹر حنیف کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ سلیم ان سے ملنے کے بعد جب چارہ کترنے لگا تو ظفر نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔

"تم چھوڑو ان کاموں کو یہ اب ہم کر لیں گے۔ تم شہر جانے کی تیاری کرو۔"

سلیم نے پریشانی سے پوچھا۔

"کیوں؟"

"بس اس میں بھی بہتری ہے تم ضد نہ کرو۔ میں تمہارے لیے شہر میں نوکری تلاش کر آیا ہوں "سروس شوز کمپنی" میں اور غریب پورہ میں کرائے کا مکان بھی لے آیا ہوں۔ بشیر تمہارے ساتھ چلا جائے گا۔ تمہیں مکان بھی دکھا آئے گا اور نوکری

پر بھی لگا آئے گا۔ کشور بھی تمہارے ساتھ جائے گی۔

"پر میں یہاں سے جاؤں کیوں بھیا! کھیتی باڑی کون کرے گا۔ گھر کا سا دھندا ہی رک جائے گا۔"

"نہیں رکتا، ہم تینوں بھائی جو ہیں۔"

"تو کیا تم لوگ اپنی نوکری پر نہ جاؤ گے۔"

"جائیں گے۔ ابھی تو ہماری دو دو ماہ کی چھٹی ہے نا۔"

"آپ لوگ گھر آرام کریں بھیا! میں اب سروس نہیں کروں گا۔ میرے اب یہ گھر کا کام ہی مناسب ہے۔"

ماسٹر حنیف نے بھی سمجھایا۔

"چلے جاؤ بیٹے! ہم سب نے سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔ اس میں ہے۔" سلیم پھر بھی نہ مانا۔

"مجھے پتہ ہے یہ چوہدری سے جھگڑا کریں گے۔ ایسی صورت میں ا بھائیوں سے میں دور کیسے چلا جاؤں۔"

غفور نے بڑی شفقت سے سمجھایا۔

"تمہیں کشور کی خاطر جانا ہے بیٹے! وہ کئی دنوں سے لگاتار ہے۔ اس حالت میں تو وہ بچ نہ سکے گی۔ تم اسے لے کر شہر چلے جاؤ۔"

گلشن نے بھی سمجھایا۔ شبیر، بشیر اور منشی امین نے بھی زور ڈالا وہ بادل نخواستہ جانے پر رضامند ہو گیا۔

آخری بس ابھی جانا تھی۔ بشیراں دونوں کو لے کر شہر آیا اور غریب

میں گورنمنٹ ہائی سکول کے سامنے والی گلی کے ایک مکان میں وہ داخل ہوئے۔ اچھا خاصا مکان تھا۔ صحن میں نلکا بھی تھا۔

شام سے پہلے ہی وہ وہاں پہنچ گئے تھے۔ کشور نے سارے مکان کی صفائی کر کے خوب دھویا اور بڑی نفاست کے ساتھ بستر جما کر وہ دوسرا سامان درست کرنے میں لگ گئی۔ ضرورت کا سارا سامان وہ گھر سے لے کر آئی تھی۔ بشیر اسے دوسرے روز سروس پہ لگا کر گھر واپس چلا گیا تھا۔

شروع شروع میں تو سلیم نے سروس میں کوئی خاص دلچسپی نہ لی تھی۔ مگر اپنے گھر کے حالات کو دیکھتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو تبدیل کر لیا تھا اور زیادہ پیسہ کمانے کی خاطر وہ اوور ٹائم بھی لگانے لگا تھا۔

روزانہ وہ صبح سویرے گھر سے نکل کر حیوانات کے ہسپتال کے پاس سے گزرتا ہوا جناح روڈ پر آتا اور پھر وہاں سے بائیں جانب نکلنے والی سڑک پر سویڈش پاک انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کے پاس سے گزرتا ہوا سروس شوز کمپنی میں چلا جاتا تھا۔ دوپہر کا کھانا وہ گھر آ کر کھا جاتا تھا۔

کشور اس کی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کا بھی اس قدر خیال رکھتی کہ اکثر سلیم بھی اس کی اس قدر چاہت پر حیران رہ جاتا تھا۔

کچھ دن کا وقفہ ڈال کر بڑے بھائی ظفر نے ہل جوتا۔ شبیر اور بشیر بھی ساتھ گئے تھے۔ رائفلیں بھی ان کے پاس تھیں اور وہ ساتھ ہی ایک کھیت میں چھپ کر بیٹھ گئے تھے۔

ظفر نے ابھی تھوڑی دیر ہی ہل چلایا تھا کہ چوہدری کے آدمی آ گئے اور

اور بیلوں کے سامنے کھڑا ہو کر انہیں روک دیا۔ ظفر غصے میں لال پیلا ہو گیا تھا۔
ہل ایک طرف جھکاتے ہوئے اس نے کرخت آواز میں پوچھا۔
"کیا بات ہے؟"
وہی پہلے والا بدمعاش جو سلیم کا ہل روکا کرتا تھا تحکمانہ سے انداز میں بولا
"سلیم نے تمہیں نہیں بتایا کہ زمین نہیں جوتنی۔"
"کیوں نہیں جوتنی؟"
"بس ہماری مرضی۔"
"وہ سلیم تھا۔ میرا نام ظفر ہے جس روز میرا ہل رک گیا اس دن تم بھی
نہ ہو گے۔ یہ کوئی انسانیت ہے کہ تم لوگ جس کا چاہے ہل روکتے پھرو۔ سامنے
سے ہٹ جاؤ ورنہ وہ درگت بناؤں گا کہ گاؤں جانے کا راستہ بھول جاؤ گے۔
"تو تم بھی مصالحہ چاہتے ہو۔"
ظفر ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔
"تم میں سے جسے اپنی جوانی پہ کوئی شک ہو وہ آؤ میرے سامنے"
وہ سب مل کر اس پر پل پڑے۔ ظفر ان کی خوب پٹائی کرنے لگا۔ شبیر
اور بشیر بھی بھاگتے ہوئے کھیت سے باہر آ گئے اور انھوں نے رائفلوں کے بٹ
مار کر سب کو دوہرا کر کے رکھ دیا۔
چودھری کے آدمی اس روز خوب پٹ کر بھاگ گئے تھے۔



(۱۱)

ظفر باجرے کا چارہ لے کر گھر کی طرف آ رہا تھا کہ سامنے سے اسے چودھری
کے دو آدمی آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ چارے کے گرد بھری ہوئی رسی میں اس
اپنی رائفل بھی اڑس رکھی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ چارے کو سنبھالے ہوئے تھا
دوسرا ہاتھ آپ ہی آپ رائفل کے بٹ پر چلا گیا تھا۔
چودھری کے آدمی جب اس کے پاس سے گزرنے لگے تو ان میں سے
نے اپنا بایاں ہاتھ زور سے چارے پہ مارا اور وہ ظفر کے سر سے نیچے گر
۔ وہ دونوں ہنس رہے تھے۔ ظفر نے انہیں قہر آلود نگاہوں سے گھورا۔
"کس نے دھکا دیا مجھے؟"
ان میں سے ایک نے اپنی چھاتی پہ ہاتھ مارا۔

"میں نے۔"

"کیوں؟" ظفر کی آواز میں تحکم تھا۔

"بس میری مرضی، کر لو جو کچھ کرنا ہے۔"

ظفر نے پلک جھپکنے میں رائفل نکال لی اور زور سے گرجا۔

"ذلیل کتے! میں تیری زبان کھینچ لوں گا۔" اس کے ساتھ ہی اس نے پُو قوت سے رائفل کا بٹ اس زور کے سر پر دے مارا وہ چکرا کر گرا اور دم دیا۔ اس کا دوسرا ساتھی بھاگ نکلا تھا اور شور کر رہا تھا۔

"ظفر نے قتل کر دیا۔ ظفر نے قتل کر دیا۔ قاتل، قاتل، پکڑ لو اسے"

ظفر نے جھک کر لاش کو دیکھا۔ تھوڑی دیر کے لیے اس کے چہرے تاسف کے سائے نمودار ہوئے پھر جلد ہی وہ سائے بربریت میں ڈوب کر گئے۔ قاتل جو ہو گیا تھا۔

دفعتہً اس کے ہاتھوں نے حرکت کی، رائفل کا بلٹ آگے پیچھے ہوا اس نے بھاگنے والے کو تاک کر دو گولیاں ماریں تو وہ بھی خون میں نہا گیا تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔

گاؤں کی طرف سے چوہدری کے آدمیوں کا ایک ریلہ نکل کھڑا ہوا وہ سب لاٹھیاں اور کلہاڑیاں اور چند ایک رائفلیں بھی اٹھائے ہوئے اور شور کرتے آ رہے تھے۔ ان میں چوہدری حاکم اور اس کے دونوں اختر اور اشرف بھی تھے اور وہ تینوں رائفلیں اٹھائے ہوئے تھے۔

ظفر زمین پر لیٹ گیا تھا۔ لوگوں کا ریلہ آگے ہی بڑھتا جا رہا تھا

ں ایک طرف سے شبیر اور بشیر نمودار ہوئے اور وہ ہوائی فائر کرتے ہوئے ظفر ی طرف بڑھنے لگے۔ گاؤں سے نکلے ہوئے لوگ خوفزدہ ہو گئے اور واپس اؤں کی طرف بھاگنے لگے۔ چوہدری اور اس کے بیٹے تھوڑی دیر کھڑے خاموشی ے ساتھ لوگوں کو واپس جاتے ہوئے دیکھتے رہے پھر وہ بھی واپس لوٹ گئے۔

اسی وقت ظفر بھی اٹھا اور فائر کرتا ہوا ان کے پیچھے بھاگا۔ شبیر اور بشیر ھی اس کے ساتھ ساتھ بھاگ رہے تھے۔ گاؤں کے سب لوگ بھاگ ھاگ کر اپنے گھروں میں گھس گئے۔ چوہدری حاکم اپنے دونوں بیٹوں ر پندرہ بیس حواریوں کے ساتھ اپنی حویلی کی طرف بھاگنے لگا۔ وہ تینوں ائی بھی ان کے پیچھے تھے۔

حویلی میں داخل ہو کر وہ سب ایک کمرے میں گھس گئے اور اندر سے نڈی لگا لی۔ ظفر نے بڑی تیزی سے کچھ سوچا اور پھر اس دروازے کی باہر سے یر لگا کر دوبارہ باہر بھاگتے ہوئے اس نے اپنے دونوں بھائیوں سے کہا۔

"تم دونوں یہیں کھڑے رہنا۔ میں ابھی لوٹتا ہوں اور ہاں دروازے سامنے نہ کھڑے ہونا۔ وہ لکڑی کی اس ناند کے پیچھے آڑ لے کر بیٹھ جاؤ۔"

زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ ظفر واپس آ گیا۔ اس کے کندھے پر کدال، ایک ھ میں اپنی رائفل اور دوسرے ہاتھ میں کپڑے کا تھیلا تھا جس میں دستی بم تھے۔ ئے ہاتھ کے اشارے سے دونوں بھائیوں کو اپنے پیچھے آنے کو کہا، اور ڑھیاں چڑھ کر چھت پر آ گیا۔

تینوں بھائیوں نے کدال سے چھت میں سوراخ کیا اور پن نکال کر

دو دستی بم اندر پھینک دیئیے ۔ چودھری حاکم کے پندرہ بیس حواری سب
گئے تھے مگر وہ خود، اس کے دونوں بیٹے اور بیوی بچ گئے تھے کیونکہ ج
وہ اُوپر سے چھت میں سوراخ کر رہے تھے تو چودھری خطرے کی بُو پا گیا
اور اپنے بیٹوں اور بیوی کے ساتھ درمیانی دروازے سے حویلی کے دوسر
سمت چلا گیا تھا ۔ ان تینوں نے چودھری کے گھوڑے کھولے اور اس
حویلی سے باہر نکل گئے ۔

تینوں بھائی گھر آئے ۔ غفور اور گلشن سخت پریشان دکھائی دے
تھے ۔ گلشن انہیں دیکھتے ہی ان کی طرف بھاگی اور گلوگیر آواز میں ظفر سے

"خیریت تو ہے نا بیٹے !

ظفر نے نفی میں سر ہلا دیا ۔

"نہیں ماں !"

"ہائے میرے اللہ !" گلشن دونوں ہاتھ ملنے لگی ۔

"کچھ کر تو نہیں آئے ہو بیٹا !"

دکھ بھری آواز میں ظفر نے کہا ۔

"ہاں ماں ! ہم نے وہی کیا ہے جو ایک روز ہونا تھا ۔ ہم ایک
کئی قتل کر آئے ہیں"۔

گلشن رو دی ۔

"اب کیا ہو گا بیٹے !"

ظفر نے اس کی ہمت بندھائی ۔

"حوصلہ نہ ہارنا ماں !"

گلشن رو پڑی ۔

"پولیس پکڑ کر لے جائے گی بیٹے !

"نہیں ماں ! ہم یہاں سے جا رہے ہیں"۔

"کہاں جاؤ گے بیٹے !" گلشن ہچکیاں لے رہی تھی ۔

"جو کچھ ہونا تھا سو ہو چکا ماں ! اب ہمیں اپنے آپ کو تقدیر پر چھوڑنے
کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں ۔ قتل ہم نہ بھی کرتے تو چودھری نے ہمیں سکون
کی زندگی بسر نہ کرنے دینا تھی ۔ وہ ایک عذاب کی صورت میں ہم غریبوں پر مسلط
ہو گیا تھا ۔ اب اس کا زور کم ہو جائے گا اور اگر وہ مر گیا ہے تو سکون ہی
ہو جائے گا ۔

غفور بھی پاس آ کھڑا ہوا ۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی اور غمگین
غمگین سے جذبات تھے ہولے سے اس نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا ۔

"زندگی میں کوئی ایسا غلط کام تو نہ کیا تھا جس کی ہمیں اتنی بڑی سزا مل
رہی ہے ۔ بہر حال خدا سے بہتری کی ہی اُمید ہے ۔ تم تینوں بھائی کچھ عرصہ
کے لیے روپوش ہو جاؤ"۔

اتنا کہنے کے بعد وہ اندر گیا اور کچھ روپے لا کر ظفر کو تھما دیئے ۔

"یہ اپنے پاس رکھ لو اور وقت ضائع کیے بغیر دریا کے کنارے والے
جنگل کی طرف نکل جاؤ اور اگر ممکن ہو تو بارڈر ہی پار کر جاؤ"۔

ظفر نے روپے لے لیے اور گلوگیر آواز میں کہا ۔

"بابو! ہمارا ایک بھائی تو قتل ہو گیا۔ ہم تینوں قاتل بن گئے۔ ا
سلیم رہ گیا ہے جس لاڈ اور پیار سے وہ پلا تمہیں پتہ ہی ہے' ہمارے
اس کا اور کشور کا خیال رکھنا اور کوشش کرنا کہ وہ لڑائی جھگڑوں میں نہ آ
پائے ——— اس کے ساتھ ہی وہ تینوں بھائی گھر سے باہر آ کر گھو
پر سوار ہوئے اور انہیں سرپٹ دوڑاتے ہوئے دریا کے کنارے جنگ
کی طرف نکل گئے۔



(۱۲)

کشور اپنے گھر میں کھانا پکا رہی تھی کہ دروازے پر کسی نے دستک دی
سلیم کا آفس سے لوٹنے کا ابھی وقت نہ ہوا تھا۔ وہ کچھ پریشان ہو گئی۔ تاہم
وہ اُٹھی اور دروازے کے پاس آکر ہولے سے پوچھا۔

"کون ہے؟"

باہر سے کسی کی آواز آئی۔

"بیٹی! میں غفور ہوں۔ دروازہ کھولو۔"

جونہی کشور نے دروازہ کھولا بوڑھا غفور اندر داخل ہوا۔ اس کے سر
پر بڑی سی ایک گٹھڑی تھی اور اس کی چاندی جیسی سفید داڑھی گرد آلود تھی۔
اس کی کمر پہلے کی نسبت کچھ زیادہ جھک گئی ہوئی تھی اور دائیں ہاتھ میں اس

سنے لاٹھی بھی تھام رکھی تھی جس کے سہارے وہ چل رہا تھا۔

اندر آتے ہی اس نے کشور کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

"کیسی ہو بیٹی!"

کشور نے اس کے سر سے گٹھڑی اتاری۔

"ٹھیک ہوں بابو!"

غفور کو لا کر اس نے پلنگ پر بٹھایا اور خود اس کے سامنے ہی بیٹھے ہوئے بڑے شوق سے پوچھا۔

"ماں کا کیا حال ہے بابو! اس کو بھی ساتھ لے آتے؟"

"گھر پر بھی تو کسی کو رہنا چاہیئے تھا۔"

"کیوں؟ ظفر، بشیر اور شبیر تو ہیں۔"

"وہ تو بیٹی! ——— غفور رک گیا۔ شاید بات کو دبانا چاہتا تھا

کشور فکر مند ہو گئی۔

"کہاں ہیں وہ؟"

غفور غمگین سے انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"چپ کیوں ہو گئے ہو بابو! بولو نا" کشور نے اس کا گھٹنا ہلایا۔

"نہ ہی پوچھو تو اچھا ہے۔"

"کیوں نہ پوچھوں بابو!"

"وہ مفرور ہیں آج کل۔"

کشور بجھ سی گئی۔

"مفرور ہیں، پر کیوں؟"

"انہوں چودھری حاکم کے بیس آدمی قتل کر دیئے ہیں۔ وہ چودھری حاکم اور اس کے بیٹوں کو بھی قتل کرنا چاہتے تھے مگر وہ تینوں بچ گئے۔ چودھری کے آدمیوں نے ظفر کا ہل روکا تھا۔ بس اسی پر بات بڑھ گئی۔"

رو دینے والی سی آواز میں کشور نے پوچھا۔

"کہاں ہیں وہ ان دنوں؟"

"بس جگہ جگہ چھپتے پھرتے ہیں۔ پر تم اس بات کا ذکر سلیم سے نہ کرنا وہ خواہ مخواہ ہی فکر مند رہے گا۔ میں جب چلا جاؤں تو میرے بعد بیشک بتا دینا۔ پھر اسے گاؤں کی طرف نہ آنے دینا۔ میں جانتا ہوں کس حال میں گاؤں کے اندر میں رہ رہا ہوں۔ چودھری کے آدمی ابھی تک اس لیے نہیں بول رہے کہ مظفر۔ بشیر اور شبیر زندہ ہیں اور وہ کسی وقت بھی ان کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔"

"اپنی زمین کا کیا ہوا؟"

"ابھی تک تو ویسے ہی پڑی ہے۔ کسی کو حصے پر دینے کی بات کرونگا۔"

"اور ہمارے بیل بابو!"

"انہیں بیچ دوں گا بیٹی! جی تو نہیں کرتا کہ جو پیشہ ہمارے آباؤ اجداد برسہا برس سے کرتے آئے ہیں اسے چھوڑ دیں۔ پر کیا کروں تقدیر نے ہمیں ایسا آن لپیٹا ہے کہ ہر کام ہماری مرضی کے خلاف ہی ہو رہا ہے۔"

کشور کا سر جھک گیا تھا اور آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے تھے۔

غفور بچارے نے شاید بات کا رُخ بدلنے کی خاطر اپنی چادر کے پلّے میں لگی ہوئی گانٹھ کھولتے ہوئے کشور سے کہا۔

"یہ انڈے سنبھال لو بیٹی! تمہاری ماں کئی دنوں سے جوڑ رہی تھی۔ آج کل تمہاری ساری مرغیاں انڈے دے رہی ہیں۔ روز تین چار انڈے بیچ دیتے ہیں اور اچھا خاصا خرچ چل جاتا ہے۔ پچھلے ماہ سلیم نے جو روپے بھیجے تھے وہ بھی مل گئے ہیں"۔

کشور پھر بھی نہ سنبھلی اور چپ چاپ انڈے لے کر ایک طرف رکھ آئی غفور نے پھر اسے باتوں میں لگانے کی ضرورت محسوس کی اور گٹھڑی کھولنے لگا۔

"یہ چیزیں بھی سنبھال لو بیٹی!" اس نے گٹھڑی کھول دی۔ گھی۔ آٹا چاول اور دالیں تھیں۔ کشور انہیں علیحدہ علیحدہ کر کے اندر رکھ آئی۔

غفور نے پھر اُسے الجھا دیا۔

"مجھے تو بھوک لگی ہے بیٹی!"

کشور باہر نکل گئی۔

"ابھی لاتی ہوں باپو!"

کشور نے اسے کھانا کھلایا۔ سردی ہو گئی تھی۔ بعد میں اس نے اسے چائے بھی پلائی۔ اتنے میں سلیم اندر داخل ہوا۔ باپو کو گھر دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا۔ غفور بھی اسے دیکھ کر کھل گیا اور اُسے لپٹا کر اس کی پیشانی چومتے ہوئے جی بھر کر پیار کیا۔

سلیم جب پیچھے ہٹا تو کشور نے خود اس کا کوٹ اُتارا اور ایک طرف ہینگر میں لٹکا دیا۔ پھر اس نے اس کی ٹائی کھولی اور اسی ہینگر میں لگا دی۔

سلیم کے گھر میں داخل ہوتے ہی کشور نے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر لی تھی۔ پر اندر سے تو وہ رو رہی تھی نا بچاری۔

سلیم غفور کے سامنے ہی بیٹھ گیا اور بڑے لاڈ سے پوچھا۔

"ماں کو بھی ساتھ لے آتے باپو! میں تو اسے دیکھنے کو ترس گیا ہوں۔ کچھ دنوں تک میں خود ہی گھر جانے کی سوچ رہا تھا"۔

"اگلے ہفتے ساتھ لاؤں گا بیٹا!"

"بھائی کیسے ہیں؟"

"ٹھیک ہیں"۔

"کوئی بھینس دودھ دیتی ہے؟"

"دونوں دیتی ہیں۔ ایک کا بیچ دیتے ہیں اور دوسری کا رکھ لیتے ہیں۔ میں تمہارے لیے پانچ سیر گھی لایا ہوں فکر نہ کرو"۔

سلیم مسکرا دیا۔

"میں نے یہ تھوڑا ہی پوچھا ہے کہ میرے لیے گھی لائے ہیں؟"

"پر مجھے تو احساس ہے نا اور ہاں تمہاری ماں کہہ رہی تھی کہ انہیں کہنا ڈالڈا نہ کھائیں میں گھر سے ان کے لیے گھی بھیجتی رہوں گی اور اب تو ماشاء اللہ تمہاری صحت پہلے سے بہت اچھی ہے۔ کشور کی صحت بھی پہلے سے اچھی ہے۔ کیا کھاتے ہو تم لوگ یہاں۔

سلیم اور کشور دونوں ہنس دیئے۔ کشور نے چور نگاہوں سے سلیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کھانا کیا ہے باپو! گھر سے جو کچھ آتا ہے وہی کھاتے ہیں"۔

سلیم نے شرارت کی۔

"کشور کے ہاتھوں میں ہی کوئی رس ہے باپو!"

کشور شرما گئی۔ غفور نے بھی مسکرا کر کہا۔

"تم تو دن بھر دفتر رہتے ہو اور یہ بچاری گھر پر اکیلی پڑی پڑی گھبرا جاتی ہوگی"۔

"پہلے کچھ دن گھبرائی تھی باپو! پر اب اس کا بندوبست میں نے کرلیا ہے"

"کیا بندوبست کیا ہے تم نے"؟

"یہ تھوڑا بہت پڑھنا لکھنا تو پہلے ہی جانتی تھی۔ اب میں نے اسے خوب اچھی طرح لکھنا پڑھنا سکھا دیا ہے۔ پوری پوری رات اس پر محنت کرتا رہا ہوں۔ پہلے تو پڑھتی ہی نہ تھی۔ ایک دو بار میں نے اسے مارا بھی پھر جا کر کہیں اس نے پڑھنا شروع کیا۔ اب میں اسے کتابیں رسالے لا دیتا ہوں اور یہ پڑھتی رہتی ہے"۔

کشور مسکرا کر سلیم کی طرف دیکھ رہی تھی۔

غفور نے سختی سے کہا۔

"تم نے کیوں مارا بیٹے!"

کشور فوراً بول پڑی۔

"کہاں مارا ہے باپو! ایسے ہی مذاق کرتے ہیں۔ جب سے ہم یہاں آئے ہیں ہم تو کبھی آپس میں اونچا تک نہیں بولے نہ ہی آپس میں ناراض ہوئے ہیں۔ یہ تو پڑھاتے ہی نہیں تھے باپو! دفتر سے آتے ہی پلنگ پر گر جاتے تھے۔ میں تھک گیا ہوں۔ میں خود زبردستی ان سے پڑھتی رہی ہوں۔ رات کو مجھے پڑھاتے پڑھاتے میرے سامنے بیٹھے ہی سو جایا کرتے تھے اور ہاں باپو! میں نے کپڑے سینے کی مشین بھی لے لی ہے۔

ماں اور تمہارے لیے میں نے کپڑے بھی سی کر رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی قمیضیں، پاجامے اور شلواریں بھی میں خود ہی سیتی ہوں صرف پتلون کی ابھی تک صحیح سمجھ نہیں آئی۔ وہ بھی جلد ہی سمجھ جاؤں گی۔

یہاں ہمسائے میں ایک عورت سلائی کا سارا کام جانتی ہے۔ میں روزانہ اس کے پاس سیکھنے جاتی ہوں۔ یہاں درزی سلائی بہت لیتے ہیں باپو! پچھلے ماہ میں نے ان کے لیے ایک پتلون اور قمیض کا کپڑا لیا تھا اور جتنی اس کی قیمت تھی اتنی ہی درزی نے سلائی لے لی تھی۔

غفور بے حد خوش دکھائی دے رہا تھا۔

"تو بازار سے سودا سلف تم خود خریدتی ہو"۔

کشور کی بجائے سلیم بولا۔

"ہر چیز یہی خریدتی ہے باپو! ویسے سودا بڑا زبردست کرتی ہے۔ جھگڑ کر قیمتیں کافی کم کرا لیتی ہے میں تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ میرے لیے بھی یہ کپڑے خود اپنی پسند کے خریدتی ہے۔ مجھے تو بس سلے سلائے

رل جاتے ہیں۔ اور پہن لیتا ہوں۔ گھر کی مالک اور وزیر خزانہ سب کچھ یہی ہے
غفور نے دونوں کے سروں پر ہاتھ رکھ دیئے۔
"شاباش میرے بچّو! خدا کرے تم دونوں ہمیشہ کے لیے آپس میں اتفاق اور پیار سے رہو۔ مجھے اب اجازت دو میں چلتا ہوں۔"
سلیم نے اس کا بازو پکڑ لیا۔
"آج کیسے جاؤ گے باپو! پورا ایک ہفتہ رکھوں گا اپنے پاس۔"
"نہیں بیٹا! میرا گھر جانا بے حد ضروری ہے۔"
"کوئی ضروری نہیں۔"
"ضروری ہے بیٹے! کشور تمہیں سب کچھ بتا دے گی۔"
"بھائی گھر ہی ہیں نا۔"
"ہیں۔"
"اُن کی چھٹی تو کئی ماہ ہوئے ختم ہو چکی ہے پھر وہ واپس کیوں نہیں گئے"
"اس بات کا جواب بھی تمہیں کشور ہی دے گی۔"
"آپ خود کیوں نہیں بتاتے۔"
"بس تم مجھے جانے دو بیٹا!" وہ کھڑا ہو گیا۔
کشور پھر افسردہ ہو گئی اور سلیم کی طرف دیکھتے ہوئے زخمی سے لہجے میں کہا۔
"جانے دیں، باپو ٹھیک کہتا ہے۔ آپ ذرا آئیں میرے ساتھ!"
سلیم کے ساتھ وہ دوسرے کمرے میں آئی۔ سلیم کے اٹیچی سے اس

نے میلے ہوئے کچھ کپڑے نکالے اور سلیم سے کہا۔
"یہ دو جوڑے ماں کے ہیں اور ۲دو باپو کے اور کیا ساتھ دیں۔"
"کیا دو گی؟"
"سو روپے دے دیتی ہوں۔ آج کل گھر میں سخت ضرورت ہے روپوں کی۔"
دے دو نا مجھ سے کیوں پوچھتی ہو۔
پوچھنا تو چاہیے نا۔
اچھا جلدی کرو۔
باپو کو بس میں چڑھانے جائیں گے نا۔
ہاں جاؤں گا۔
میں بھی نہ چلوں۔
چلو نا، اتنی عاجزی سے کیوں پوچھتی ہو۔
باپو اور ماں کے کپڑے کشور نے ایک جگہ باندھے۔ سو روپیہ بھی ساتھ لیا اور مکان کو تالہ لگا کر وہ غفور کو بس چڑھانے چلے گئے۔ بس سٹینڈ کی ساتھ والی دکانوں سے کشور نے باپو کو ڈھیر سا فروٹ، پھول گوبھی، آلو اور ہرا دھنیا، پیاز لے دیا۔
باپو کو بس میں چڑھا کر وہ دونوں تانگے میں گھر آئے۔ سلیم کمرے میں آ کر کپڑے بدلنے لگا۔ اتنے میں کشور اس کے لیے گرم گرم چائے لے آئی۔ برتن میز پر رکھتے ہوئے اس نے بڑے پیار سے کہا "چائے پئیں۔"

سلیم پاجامے پر قمیض پہنتا ہوا اس کے قریب آیا۔

"پہلے وہ بات بتاؤ۔ جو باپو کہہ گیا ہے کہ کشور تمہیں سب کچھ بتادے گی۔"

کشور انجان سی بن گئی۔

"کیا بتاؤں، مجھے تو کچھ علم نہیں۔"

"مجھ سے نہ چھپاؤ کشور! بتاؤ بھائی کہاں ہیں؟"

کشور نے آگے بڑھ کر پیار سے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

"ایسے ہی وہم میں پڑ رہے ہیں، چلو چائے پئیں۔"

سلیم نے اپنے ہاتھ چھڑا لیے۔

"پہلے بتاؤ پھر چائے پیوں گا۔"

"کچھ بات بھی ہو تو بتاؤں۔"

"مجھے نہ ٹالو کشور! تمہارا چہرہ بہت کچھ بتا رہا ہے۔"

کشور کا سر جھک گیا اور وہ اداس ہو گئی۔

سلیم نے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔

"نہیں بتاؤ گی۔"

کشور کی پلکیں بھیگنے لگیں۔

"بتاتی ہوں۔ مگر اس شرط پر کہ آپ میرے کہنے پر عمل کریں گے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔"

"ان تینوں بھائیوں نے چودھری حاکم کے بیس آدمی قتل کر

دیئے ہیں۔"

سلیم غمگین ہو کر رہ گیا۔

"باپو نے تمہیں بتایا ہے؟"

"ہاں۔"

"مگر انہوں نے قتل کیوں کیے؟"

"چودھری کے آدمیوں نے ظفر بھائی کا ہل روک دیا تھا۔ اسی بات پر جھگڑا بڑھ گیا اور انہوں نے چودھری حاکم کے بیس آدمی قتل کر دیئے۔"

"اب کہاں ہیں وہ؟"

"باپو کہہ رہا تھا مفرور ہیں اور پولیس سے بچارے چھپتے پھرتے ہیں"۔

سلیم کرسی پر کرسی پر بیٹھتے ہوئے سوچ میں پڑ گیا۔

"بہت برا ہوا یہ تو۔ اب تو چودھری کے ساتھ ہماری عداوت خاندانی ہو کر رہ جائے گی۔ میں کل ہی گاؤں جاؤں گا۔"

کشور نے اس کی توجہ ہٹانا چاہی

"چائے تو پئیں نا۔ کوئی ضرورت نہیں گاؤں جانے کی۔"

سلیم نے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں کشور!"

کشور نے پیالی میں چائے ڈالی اور اس کے ہونٹوں سے لگا دی

"پئیں نا۔ میرے لیے۔"

سلیم نے ایک بار غور سے کشور کی طرف دیکھا۔ اس بچاری کی

پلکیں پھر بھیگ رہی تھیں۔

سلیم نے نہ جانے کیا سوچا اور چائے پینے لگا۔



(۱۳)

کھانا کھانے کے بعد سلیم اور کشور اکٹھے بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ دروازے پر کسی نے دستک دی۔

کشور نے سلیم کی طرف دیکھتے ہوئے پریشانی سے پوچھا۔

"رات کے اس وقت کون ہو سکتا ہے؟"

سلیم اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ٹھہرو! میں دیکھتا ہوں۔"

کشور نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔ پتہ نہیں کون ہے۔ پہلے اچھی طرح

اطمینان کر کے پھر دروازہ کھولیں گے۔

دروازے کے ایک طرف کھڑے ہو کر سلیم نے پوچھا۔

"کون ہے؟"

باہر سے رازدارانہ سی آواز آئی۔

"دروازہ کھولو سلیم!"

سلیم آواز پہچان گیا تھا۔ اس کے بڑے بھائی ظفر کی آواز تھی۔

آگے بڑھ کر اس نے دروازہ کھول دیا۔ ظفر اندر داخل ہوا اور دروازہ بند کر کے سلیم سے بُری طرح لپٹ گیا۔

اس نے اپنے آپ کو ایک بھاری کمبل چھپا رکھا تھا۔ سلیم سے علیحدہ ہو کر اس نے کشور کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر دونوں کے ساتھ اندر آ کر بیٹھ گیا۔

سلیم اُسے ٹکر ٹکر دیکھے جا رہا تھا۔

کیسے ہو تم دونوں۔ ظفر نے پوچھا۔

سلیم کے بجائے کشور بولی۔

"بس ٹھیک ہیں بھائی جان!"

سلیم نے کپکپاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"یہ آپ لوگوں نے کیا کر لیا بھائی جان!"

"بس جو ہونا تھا ہو گیا۔"

"چودھری کے آدمیوں نے تمہارا راہ روکا تھا۔"

"ہل بھی روکا تھا - اس علاوہ ایک روز میں چارہ لے کر آ رہا تھا تو اس کے ایک آدمی نے مجھے دھکا دے کر میرے سر سے چارہ گرا دیا۔ میں نے جب اُن سے وجہ پوچھی تو وہ لڑنے پر اُتر آئے - مجھے بھی غصہ آ گیا تھا - میرے پاس رائفل تھی میں نے اسے بٹ مارا اور وہ وہیں مر گیا - اس کا دوسرا ساتھی شور کرتا ہوا بھاگنے لگا - میں قاتل تو ہو ہی چکا تھا میں نے اُسے بھی گولی مار دی -

اس پر چودھری کے آدمیوں کا ایک ریلہ مجھ پر ٹوٹ پڑا - اتنے میں شبیر اور بشیر ہوائی فائر کرتے ہوئے میری طرف آ گئے اور گاؤں کے آدمی بھاگ نکلے - ہم نے اسے موقع جانا - میں گھر سے جا کر دستی بم لے آگیا

چودھری اور اس کے آدمی ایک کمرے میں بند ہو گئے تھے - ہم تینوں بھائیوں نے چھت سے سوراخ کیا اور اندر دستی بم پھینک دیئے اس طرح چودھری اور اس کے بیٹے تو بچ گئے مگر ان کے بیس آدمی مر گئے

سلیم نے افسوس سے کہا -

"بہت بُرا ہوا بھیا"

"ٹھیک ہی ہو گیا ہے - چودھری کے آدمی اب ہر غریب کو ا تو نہ ڈالتے پھریں گے -

"شبیر اور بشیر کہاں ہیں"

"میرے ساتھ ہی آئے ہیں - حیوانات کے ہسپتال کے سامنے

سے جناح روڈ میں جو سڑک آ کر ملتی ہے میں انہیں اس پہ ایک کھیت کے کنارے کھڑا کر آیا ہوں"

"ساتھ ہی لے آتے"

"ہمارے پاس تین گھوڑے بھی ہیں اس لیے کیسے یہاں آ سکتے تھے - میں خود چھپ چھپا کر آیا ہوں - پولیس آج کل بُری طرح ہمارے پیچھے پڑی ہوئی ہے"

"کہاں چھپے ہوئے ہو ان دنوں"

"مرالہ کا ایک بدمعاش ہے اس کا نام برکت ہے - اس کے پاس ایک تہ خانہ ہے وہاں رہ رہے ہیں - ہمارے علاوہ وہاں اور بہت سے قاتل اور بدمعاش بھی ہیں -

"تو کیا وہ اس بات کا کوئی معاوضہ نہیں لیتا"

"اچھا بھلا لیتا ہے - جو بدمعاش اس کے پاس پناہ لیے ہوئے ہیں ان سے وہ ڈاکے ڈلواتا ہے اور اچھی بھلی کمائی کرتا ہے"

"مگر یہ سب آخر کب تک"

"جب تک زندگی کے دن باقی ہیں"

سلیم اُداس ہو کر رہ گیا

ظفر نے اس کے کندھے پر ہلکے ہاتھ مارا -

"اُٹھو چلو میرے ساتھ بشیر اور شبیر کو مل آؤ"

"ذرا ٹھہریں تو کھانا تیار کراتا ہوں - آپ کھا لیں اور ان کا لے

چلتے ہیں۔ اٹھو کشور! کھانا تیار کرو۔ مگر ظفر نے روک دیا۔

"کھانا ہم نے کھا لیا ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ یہاں زیادہ دیر رکنا ہمارے لیے خطرے سے خالی نہیں اور وہاں ٹھہرو۔

اس نے جیب سے کچھ نوٹ نکال کر سلیم کی گود میں رکھ دیئے۔

"یہ رکھ لو تمہارے کام آئیں گے۔ میں نے بھی گنے نہیں۔ خبر نہیں کتنے ہیں۔ یہ کسی غریب کا مال نہیں سرمایہ داروں کی لوٹی ہوئی تجوری کا ایک حصہ ہے۔

"تم رکھو بھیا! تمہارے کام آئیں گے۔ میں تو سروس کر رہا ہوں۔"

"نہیں نہیں تم رکھو۔ ہمارے پاس ابھی اس سے بھی زیادہ ہیں اور ہاں تم کل یا پرسوں تک گھر کا چکر بھی لگانا۔ باپو بہت زیادہ پریشان ہے ان دنوں۔"

"خیریت تو ہے نا۔"

"ہمارے دونوں بیل کوئی چوری کر کے لے گیا ہے"۔

سلیم اور کشور دونوں چونک پڑے۔

"پھر۔"

"ہمیں تو گاؤں کی طرف گئے ہوئے تین دن ہو گئے ہیں۔ کیونکہ ان دنوں وہاں پولیس کی گشت کچھ زیادہ ہی سخت ہو گئی ہے۔ ویسے باپو نے جوں پور کے کھوجی رحمت کو لگایا ہوا تھا۔ پتہ نہیں کیا بنا ہے

چلو اٹھو جلدی کرو۔ بشیر اور شبیر پریشان ہو رہے ہوں گے۔

کشور نے سلیم سے پوچھا۔

"میں بھی ساتھ چلوں گی۔

سلیم کھڑا ہو گیا۔

"چلو پھر۔"

مکان کا دروازہ انہوں نے باہر سے بند کیا اور سڑک پر آنے کے بعد وہ ہسپتال کی طرف بڑھنے لگے۔

دوسرے روز سلیم نے آفس سے چھٹی لے لی اور کشور کو ساتھ لے کر وہ گاؤں آیا۔ جب وہ گھر داخل ہوا تو شام ہو رہی تھی۔ غفور سامنے تخت پوش پر کسی گہری سوچ میں غرق خاموش بیٹھا تھا۔ وہ اداس تھا اور غمگین بھی۔ صحن کے ایک کونے میں گلشن چولہا رکھے کھانا پکا رہی تھی۔ انہیں دیکھتے ہی گلشن بھاگ کر ان کی طرف بڑھی اور دونوں کو بُری طرح چوم چوم کر پیار کرنے لگی۔

تینوں غفور کے پاس آئے وہ بھی ان دونوں سے ایسے ملا جیسے برسوں کا بچھڑا ہوا ہو۔ انہیں دیکھتے ہی اس نے اپنے لبوں پر مسکراہٹ پھیلا دی تھی مگر سلیم اس کا اندازہ لگا چکا تھا وہ اس کے پہلو میں ہی بیٹھ گیا اور آہستگی سے پوچھا۔

"بیلوں کا کیا بنا باپو!"

غفور نے منہ سے تو کچھ نہ کہا۔ تاہم وہ خاموشی سے ٹکٹکی باندھے

سلیم کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ہونٹ بُری طرح بھنچے ہوئے تھے اور اُن میں دُور دُور تک شکوے ہی شکوے اور ویرانیاں ہی ویرانیاں تھیں

سلیم نے اس کا شانہ ہلایا۔

"کہاں کھو گئے ہو باپو! مَیں نے کیا پوچھا ہے۔

غفور چونک گیا۔

"ہائیں"

"بیلوں کا کیا ہوا؟"

"چوری ہو گئے۔"

"وہ تو مجھے بھی پتہ ہے۔ یہ بتاؤ ملے ہیں یا نہیں۔ جعلن پورے کھوجی نے کیا کیا ہے؟"

بہت دُور سے غفور کی آواز سُنائی دی۔

کھوجی نے تو ڈھونڈ ہی دیئے تھے۔ بَیل مَیں نے اپنے دیکھ بھی لیے تھے۔

"پھر کیا ہوا؟"

غفور کی آواز ڈوب کر رہ گئی۔

"کیا ہوا؟ آہ! جنہوں نے چرائے ہیں وہ نہیں دیتے۔"

"کس نے چرائے ہیں؟"

مچھرالہ کے بدمعاش شفیع نے جو چودھری حاکم کا داماد ہے۔

"کیا کہتا ہے۔"

"بس نہیں دیتا"

"پولیس سے کہا ہوتا۔"

"کون پوچھتا ہے۔ اس ظالم نے جون پور کے کھوجی اور اس کے جوان بیٹے کو بھی قتل کر دیا ہے۔ صرف اس پاداش میں کہ اس کے ہمارے بَیلوں کا کھوج لگا لیا تھا۔ اس بچارے کی بیوی پاگل ہو گئی ہے اور جوان بیٹی بے سہارا ہو گئی ہے۔ مَیں کل گیا تھا اور اُنہیں کچھ رقم دے آیا تھا۔

سلیم کھڑا ہو گیا۔

"مَیں خود جاتا ہوں باپو! مَیں اپنے بَیل لے کر ہی لوٹوں گا۔ اب مَیں نوکری بھی نہیں کروں گا۔ دوبارہ پھر اپنی زمین جوتوں گا۔"

غفور نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"نہیں، نہیں بیٹے! ادھر نہ جانا۔ ان کے گھروں پر پولیس کا پہرہ ہے۔ بیل اگر زبردستی آ سکتے تو تمہارے بھائی اب تک لے آئے ہوتے۔ ظفر، بشیر اور شبیر کے خوف سے چودھری حاکم اور اس کے رشتہ داروں نے اپنے مکانوں پر پولیس کا پہرہ بٹھا لیا ہے۔

سلیم نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"مَیں ضرور جاؤں گا باپو! ظلم کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ مَیں ——— مَیں ——— مَیں اب تک خاموش رہا۔"

لوگ مجھے بزدل کہتے رہے۔

"میں نے سکون اور شانتی کی زندگی بسر کرنا چاہی مگر یہ لوگ جینے نہیں دیتے باپو!" اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔

"میں اب ان سے یہ حق چھین کر رہوں گا"

"میں اب انہیں بتا دوں گا

میں بزدل نہیں

ان کے اندر میں بھی جینے کی ہمت رکھتا ہوں۔

گلشن نے بھی اس کا ہاتھ پکڑ کر پیار سے سمجھایا۔

بیٹھو، بیٹھو بیٹا! ہمیں کوئی ضرورت نہیں جھگڑا کرنے کی۔

کشور نے بھی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"بیٹھیں آرام سے، ہم جھگڑا نہیں کرتے کسی سے"

سلیم پھر پھٹ پڑا۔

"نہیں ماں! اب میں ان سے ضرور بات کروں گا۔

وہ میرا دل روکتے رہیں میں خاموش رہا۔

وہ چار چار پانچ پانچ آدمی مل کر مجھے مارتے رہے۔ میں نے خاموشی سادھے رکھی اس لیے کہ میں بات کو طول نہ دینا چاہتا تھا۔ ورنہ —— ورنہ تمہارے دودھ کی قسم ماں! میں ان پانچوں پر بھاری تھا۔ میں بھی مار مار کر ان کی گردن توڑ دیتا تھا۔ پھر یہ میری شرافت تھی کہ میں پُرسکون اور مظلوم بنا رہا۔

گلشن نے ذرا غصے میں کہا۔

"بیٹھ جاؤ سلیم! یہ میرا حکم ہے"

سلیم زیادہ ہی بپھر گیا تھا۔

"کب تک خاموش رہیں گے ہم ماں! ایک بھائی قتل ہو گیا۔ تین مفرور قرار دے دیئے گئے۔

یہ لوگ ظالم ہیں۔

یہ —— یہ قانون اندھا ہے۔

یہ انصاف بھٹکا ہوا ہے۔

یہاں کوئی قانون کا محافظ نہیں۔

یہاں کوئی انصاف کا سرپرست نہیں۔

مظلوم کو اور کچلا جاتا ہے۔

ہمارا بھائی بھی مر گیا۔ ساری دولت بھی لٹ گئی۔ مجرم پھر بھی رہا ہو گئے۔

کدھر گیا قانون؟

کہاں ہے انصاف

لوگوں نے انصاف اور قانون کی دکانیں کھول لی ہیں۔

ماں! تمہیں اپنے پیدا کرنے والے کی قسم! تمہیں اپنے مرحوم بیٹے کی قسم! تمہیں تمہارے ہی ستھرے اور صاف خون کی قسم! میری راہ نہ روکو۔

مجھے جانے دو۔

ماں! مجھے تمہاری ہی قسم! میں پچھلے سارے ادھار چکا دوں گا۔

گلشن نے اس کو غصے میں جھڑک دیا۔

"چُپ رہو سلیم! تم نہیں جاؤ گے۔"

کشور نے بھی بڑی بیچارگی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے رو دینے والی آواز میں کہا۔

"بیٹھیں نا۔"

سلیم اپنا ہاتھ چھڑا کر باہر کی طرف لپکا۔

آج چوہدری حاکم اور اس کے داماد سے میں ضرور بات کروں گا ماں!

سلیم ابھی چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ گلشن اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور ایک بھرپور طمانچہ سلیم کے منہ پہ مارتے ہوئے وہ زور سے چلائی۔

میری چار انگلیاں تو پہلے ہی کاٹ دی گئی ہیں۔ اب تم بھی میری نگاہوں سے اوجھل ہونا چاہتے ہو۔ اگر تمہیں ماں کا کوئی احساس نہیں۔

بیوی کے بے سہارا ہونے کی پرواہ نہیں۔

بوڑھے باپ کی دربدر ٹھوکریں کھانے کی کوئی فکر نہیں۔

تو ——— تو جاؤ۔ دفع ہو جاؤ۔ میں تمہاری شکل بھی دیکھنا پسند نہ کروں گی۔ میں سمجھوں گی میری پانچوں انگلیاں کٹ گئی ہیں۔ میں جانوں گی میرے ہاں کسی سلیم نے جنم ہی نہ لیا تھا۔ جاؤ نکل جاؤ میرے

آنگن سے۔ جاؤ لڑتے پھرو لوگوں سے۔

گلشن صحن میں آم کے درخت کا سہارا لے کر چلوؤں رونے لگی۔

ذرا فاصلے پر کشور بھی کھڑی چہکو پہکو رو رہی تھی۔ بوڑھے غفور نے اپنے نہ میں پگڑی کا پلو لے کر منہ دوسری طرف پھیر لیا تھا اور اس کی آنکھوں ے آنسو لکڑی کے تخت پوش پر ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔

سلیم بُت کی طرح کھڑا ہو کر کچھ دیر تک غفور کی طرف دیکھتا پھر اس کی نظریں گلشن پر جم کر رہ گئی تھیں۔

گلشن!

جو اس کی ماں تھی۔

جس نے اسے جنم دیا تھا۔

ماں رو رہی تھی۔

ساری دُنیا رو رہی تھی۔

اس کی جنت رو رہی تھی۔

اس کی آنکھیں چھلک گئیں۔ بھاگ کر وہ آگے بڑھا اور گلشن پاؤں پہ منہ رکھتے ہوئے وہ دُکھ بھرے انداز میں بولا۔

معاف کر دو ماں۔ مجھے معاف کر دو۔ میں کوئی کام بھی تمہاری رضامندی کے بغیر نہ کروں گا۔ میں تمہارا سہارا رہوں گا۔

تم نے مجھے جنم دیا ہے۔

میں تمہارا بیٹا ہوں۔

تمہارے آنگن میں ہی میری جنت ہے۔

میں تمہیں نہیں بھول سکتا۔

کشور کو میں نظر انداز نہیں کر سکتا۔

باپو کو میں فراموش نہیں کر سکتا۔

جیسے تم کہو گی میں ویسے ہی کروں گا۔ بس تم مجھے معاف کر دو

گلشن ابھی تک بُت بنی کھڑی تھی۔

کشور آگے بڑھی اور گلشن کا کندھا پکڑ کر ہلایا۔

اب تو انہیں معاف کر دو ماں!

گلشن چونک سی پڑی۔ دونوں ہاتھ بڑھا کر اس نے سلیم کو اوپر اُٹھایا اور اس کے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے گالوں پر بوسے دینے لگی۔



(۱۴)

سلیم کشور کو ساتھ لے کر پھر شہر آ گیا تھا اور بڑے سکون اور تندہی سے اپنی نوکری کر رہا تھا۔ باپو کو وہ ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ روپے بھجوا رہا تھا اور یوں حالات پھر اپنی پہلی سی ڈگر پر ہی چل رہے تھے کہ دوبارہ طوفان اُٹھ کھڑے ہوئے۔

اتوار کے روز سلیم اور کشور دوپہر کا کھانا کھا کر اکٹھے بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ غفور آ گیا اور دونوں کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا اور کافی کمزور بھی دکھائی دے رہا تھا۔

کشور کو کچھ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ سلیم نے پریشانی سے اس

کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"گھر پر خیریت ہے نا باپو!"

غفور شاید کسی بات کو ٹال رہا تھا۔ لہٰذا وہ اپنی چادر کا پلّو کھولنے لگا

دیکھو تو بیٹا! میں تمہارے لیے ڈھیر سے انڈے لایا ہوں اور یہ گھی بھی۔ اس نے گھی کا سفید ڈبہ بھی اس کی طرف بڑھا دیا۔

سلیم نے پھر پوچھا

امی کیسی ہے باپو!

غفور اور اداس ہو گیا۔

اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں بیٹا! میں کشور کو لینے آیا ہوں۔

سلیم فکر مند ہو گیا۔

کیا ہوا ماں کو؟

غفور پھر ٹال گیا۔

کوئی خاص بات نہیں بیٹا! تم فکر نہ کرو۔

بھائی کیسے ہیں۔ ان سے کبھی ملاقات ہوئی ہے۔

وہ تو ـــــ غفور فوراً رک گیا۔

رک کیوں جاتے ہو باپو! کیا ہوا انہیں۔

غفور کی پلکیں بھیگ گئی تھیں اور وہ رو پڑا۔

وہ ـــــ وہ قتل ہو گئے۔

سلیم اور کشور کے منہ سے ایک ساتھ نکل گیا۔

قتل ہو گئے۔

ہاں قتل ہو گئے۔ انتظامیہ نے ان کو پکڑنے کا انعام بیس ہزار روپیہ مقرر کر رکھا تھا۔ مرالہ کے بدمعاش برکت نے جس کے ہاں وہ ٹھیرے ہوئے تھے۔ رات سوتے میں ان تینوں کے سر قلم کر کے انتظامیہ کو پیش کر دیئے اور انعام کی رقم وصول کر لی۔ سنا ہے اس کا دھندا ہی یہی ہے۔

وہ بدمعاشوں کو اپنے ہاں ٹھیراتا ہے۔ ان سے خوب قتل کراتا ہے اور جب وہ اشتہاری مجرم ہو جاتے ہیں تو انہیں قتل کر کے رقم وصول کر لیتا ہے۔

سلیم غصّے میں کھڑا ہو گیا۔

میں اس بھیڑیے سے اپنے بھائیوں کے قتل کا انتقام ضرور لونگا۔

غفور نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھایا۔

بیٹھ جاؤ بیٹا! ان تینوں کے قتل سے تمہاری ماں پہلے ہی اپنے حواسوں میں نہیں رہی۔ اب تم بھی اسی راہ پر چل نکلے تو ہم جیتے جی ہی مر جائیں گے۔ تمہاری ماں نے مجھے کہلا کر بھیجا تھا کہ سلیم کو گاؤں نہ آنے دینا۔ صرف کشور میرے ساتھ جائے گی۔ اس کے وہاں ہوتے ہوئے وہ سنبھل جائے گی اور پھر میں اسے واپس چھوڑ جاؤں گا۔

میں بھی تمہارے ساتھ گاؤں جاؤں گا باپو! سلیم کی آواز میں ابھی تک غصّہ تھا۔

غفور نے پھر اسے سمجھایا۔

اگر تم اپنی ماں کو زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو یہیں رہو اور اگ
اس کی زندگی کی کوئی پرواہ نہیں تو پھر چلو میرے ساتھ گاؤں۔ میں
روکوں گا نہیں۔

سلیم خاموش رہا۔ کشور نے اسے سمجھایا۔

آپ یہیں رہیں۔ میں ایک ہفتہ رہ کر واپس آجاؤں گی۔

سلیم پھر بھی چپ ہی رہا۔

غفور پھر بولا۔

میں نے جون پور کے ایک آدمی سے بات کی ہے۔ وہ ہمار
حصے پر جوتنے کے لیے رضامند ہو گیا ہے۔ امید ہے میں دو تین د
اپنی موجودگی میں اس کا ہل اپنی زمینوں میں چلاؤں گا۔

سلیم شاید کہیں اور ہی کھویا ہوا تھا۔ تبھی اس نے
سنجیدگی سے پوچھا۔

میں پھر کب جاؤں گا گاؤں میں باپو!"

جب تمہاری ماں اجازت دے گی۔ اب تم کشور کو جا
دو کہ وہ میرے ساتھ جانے کی تیاری کرے۔ بس کا وقت بھی ہو
بڑی مشکل سے شام تک گھر پہنچیں گے ہم۔

کھانا تو کھائیں نا پہلے۔

نہیں نہیں۔ کھانا میں کھا کر نکلا تھا۔ ویسے بھی دیر
سلیم نے کشور سے کہا۔

جاؤ تیاری کرو۔

کشور جلدی ہی واپس آگئی۔ اس نے ایک اٹیچی بھی اٹھا رکھا تھا۔

سلیم دونوں کو جا کر بس میں چڑھا آیا۔

کشور کو گاؤں گئے چار روز ہو چکے تھے۔ اس رات جب کہ سلیم گھر
لا ہی گہری نیند سویا ہوا تھا۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ چہار
انی ہی پانی ہو گیا تھا۔ اس نے ایک خواب دیکھا۔

خوفناک اور بھیانک خواب۔

اس نے دیکھا اس کا باپو اپنی زمین میں ہل چلوانے لگا تھا کہ چودھری
آدمیوں نے روک دیا۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ اس کا باپو ان کی منت سماجت
ا تھا۔ اس نے اس شخص کے پاؤں بھی پکڑے جو کبھی سلیم کا ہل بھی
کرتا تھا۔ مگر انہوں نے ہل نہ چلنے دیا۔

منت سماجت سے تنگ آ کر غفور غصے میں آگیا۔ اس نے خود
تھامتے ہوئے بیلوں کو ہانک کر جب ہل چلانا چاہا تو اسی شخص نے
کے باپو کے سینے میں چمکتی ہوئی برچھی اتار دی۔

غفور کے جسم سے خون کا فوارہ پھوٹ نکلا اور وہ زمین پر گر
تھوڑی دیر تک وہ اپنے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھے تڑپتا رہا
اس کا جسم اکڑ گیا اور وہ ختم ہو گیا۔

سلیم ایک زوردار چیخ مار کر اٹھا۔

باپو!

میں آیا باپو ! میں آیا۔

وہ بھاگتا ہُوا گھر سے نکلا۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی مگر
اس کی پرواہ کیے بغیر سڑک پر بھاگنے لگا۔ شہر سے نکل کر وہ پکی سڑک
اُتر گیا اور کچے راستے پر بھاگنے لگا۔ بارش کا پانی ٹخنے ٹخنے کھڑا تھا۔

مگر وہ بھاگتا رہا۔ وہ اپنے حواس میں نہ رہا تھا۔ شہر اور گاؤں کے
درمیان تقریباً سولہ میل کا فاصلہ اس نے بھاگتے ہوئے طے۔ بارش کے
باوجود اسے پسینہ آ گیا ہُوا تھا۔

اپنے گاؤں سے ذرا دُور ہی وہ پانی کے ایک کھڈ میں بُری ط
گر گیا مگر فوراً اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اس کے کپڑے کیچڑ سے لتھڑ گئے تھے

قبرستان میں سے گزرتے ہوئے جب وہ گاؤں میں داخل
وہ سسک پڑا۔ اس کے گھر کی طرف سے رونے کی آواز سُنائی دے
تھی۔ آوازیں اس کی ماں اور کشور کی تھیں۔ وہ پہچان گیا تھا۔ ما
بیوی کی آوازیں بھی بھلا کوئی پہچاننے سے رہتا ہے۔

جب وہ گھر داخل ہُوا تو ——— تو اس نے دیکھا برآمد
پلنگ پر اس کے باپو کی لاش پڑی ہے۔ گلشن اور کشور اس سے
لپٹ کر رو رہی ہیں اور گاؤں کی عورتیں بھی ارد گرد بیٹھی آہستہ آ
رہی تھیں۔

اس نے باپو کی لاش سے کپڑا ہٹا کر دیکھا تو اس کے سینے
واقعی برچھی کا زخم تھا اور اس کا سارا لباس خون سے بھیگا ہُوا

بچارے کی چاندی کی طرح سفید داڑھی بھی خون میں رنگ گئی تھی۔ اس کا
جسم مٹی سے اٹا ہُوا بھی تھا۔

لاش کو کپڑے سے ڈھانپ کر وہ خلاؤں میں گھورنے لگا۔ اس
کے چہرے پر وحشت اور بربریت پھیل گئی تھی۔

وہی وحشت اور بربریت
جو زخمی سانپ پر چھا جاتی ہے
جو بھوکے بھیڑیے پر شکار کو اپنے سامنے پا کر سوار ہو جاتی ہے۔
جو ایک قاتل کے چہرے پر نمودار ہو جاتی ہے۔

ہاں وہی وحشت اور بربریت اس وقت سلیم کے چہرے پر
بھی چھا گئی تھی مگر یہ کیفیت اس وقت ختم ہو گئی جب اس کی ماں اُٹھ
کر اس لپٹ گئی اور زور زور سے بَین کرتی ہوئی رونے لگی۔

زندگی میں پہلی بار وہ خوب رویا اور دھاڑیں مار مار کر رویا کشور
بھی پہلے کی نسبت زیادہ اُونچی آواز میں رونے لگی تھی۔

دوسرے روز غفور کو دفن کر دیا گیا۔ شام تک افسوس کرنے والے
لوگ آتے رہے اور سلیم ان میں بیٹھا رہا۔ جب وہ ان سے فارغ ہوا تو
گھر آیا۔ گلشن نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پیار سے کہا۔

کھانا تو کھا لو بیٹے ! کل کا تم نے کچھ بھی نہیں کھایا۔

سلیم کی آواز ڈوب گئی تھی۔

بھوک نہیں ہے ماں !

کشور نے دکھ سے کہا۔

کب تک یہ حالت بنائے رکھیں گے۔

سلیم نے تھوڑی دیر تک سر جھکائے رکھا۔ پھر وہ برآمدے میں آیا اور زین اٹھا کر آنگن میں بندھی ہوئی گھوڑی پر ڈالنے کے بعد وہ اس کا تنگ کسنے لگا۔

گلشن نے پریشانی سے پوچھا۔

کہاں چلے ہو بیٹا! اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

سلیم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

آج میرا راستہ نہ روکنا ماں! آج ——— آج اگر تم نے مجھے رو تو یہ رات میری زندگی کی آخری رات ہو گی میں خود اپنے آپ کو ختم کر لوں گا۔ باپو کا غم اپنے سینے میں لیے اب مجھ سے نہ جیا جائے گا۔

گلشن رو پڑی۔

کہاں جاؤ گے۔

سلیم نے آنکھیں خشک کیں۔ اس کے چہرے پر پھر وہی وحشت اور بربریت چھا گئی تھی۔

وقت مجھے آوازیں دے رہا ہے ماں!

میرے باپو کا خون مجھے پکار رہا ہے۔

حالات مجھے ان راستوں کی طرح بلا رہے ہیں جہاں سے میرے تینوں بھائی بھی گزر چکے ہیں۔ آج میں انتقام لوں گا۔

اپنے ہر دشمن سے نمٹوں گا۔ تمہیں تمہارے آخری بیٹے ہی کی قسم ماں! آج میری راہ میں حائل نہ ہونا۔

لوگ طعنہ دیں گے۔

شریک آوازے کسیں گے۔

گلشن کا بیٹا بزدل تھا۔

بے غیرت تھا۔ جو بھائیوں کا انتقام نہ لے سکا۔

اپنے باپو کے خون کا داغ نہ دھو سکا۔

گلشن کے چہرے پر بھی سنجیدگی چھا گئی اور اس نے پُروقار آواز میں کہا۔

تم نے اگر اتنا بڑا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو ٹھہرو۔ وہ جلدی جلدی کمرے میں گئی اور ایک رائفل اور ٹاٹ کا ایک تھیلا اٹھائے واپس آ گئی۔ رائفل اس نے سلیم کو تھما دی۔ سلیم نے رائفل لے کر زین سے لٹکا دی۔ گلشن نے اسے تھیلا بھی تھما دیا۔

سلیم نے تھیلا کھول کر دیکھا۔ اس میں دستی بم، سیاہ رنگ کی لمبی نالی والا ایک ریوالور۔ اس کی گولیاں، رائفل کی گولیاں اور کچھ رقم بھی تھی۔ تھیلا بھی اس نے زین سے باندھ لیا۔

گلشن نے پھر گھگھیائی ہوئی سی آواز میں کہا۔

جاؤ، میں سمجھوں گی جہاں چار انگلیاں کٹ گئی ہیں وہاں پانچویں بھی کٹ گئی۔

سلیم نے گھوڑے کی باگ پکڑ لی۔

بس، مجھے تمہاری دعاؤں کی ضرورت ہے ماں ! اب میں مر بھی گیا تو سکون سے مروں گا۔ پر تم گھبرانا نہیں ماں ! میں اتنی جلدی نہیں مروں گا۔

میں ہر دشمن سے انتقام لوں گا پھر موت کو اپنے اوپر سوار ہونے دوں گا۔

گلشن نے پھر سنجیدگی سے کہا۔

میری ایک نصیحت یاد رکھنا سلیم !

سلیم کا سر جھک گیا۔

کہو ماں !

کسی بھی بے گناہ اور مظلوم پر ہاتھ نہ اٹھانا۔

تم فکر نہ کرو ماں ! میں خود بے گناہ اور مظلوم ہوں۔ میں ایسے لوگوں پر کیونکر ہاتھ اٹھاؤں گا۔

جاؤ پھر سپردِ خدا۔

وہاں سے ہٹ کر سلیم کشور کے پاس آیا۔ وہ برآمدے کے ستون سے لگی رو رہی تھی۔

سلیم ہلکے سے اسے پکارا

کشور

کشور نے دوپٹے کے پلو سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اس کی

طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب طرح کی بے چارگی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر سلیم کا دل رونے لگا۔ گردن جھکاتے ہوئے اس نے مدھم سی آواز میں کہا۔

میں جا رہا ہوں کشور !

سسکتے ہوئے اس نے کہا۔

میں سب کچھ سن چکی ہوں۔

موت اگر کبھی مجھ پر غالب آجائے تو تم آزاد اور اپنی مرضی کی مالک ہو گی۔ جہاں تمہارا جی چاہے ——— اس سے آگے سلیم کہہ نہ پایا۔

کشور نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میرا اور آپ کا ساتھ جنم جنم کا ہے۔ جس دن آپ ختم ہو گئے اس روز میری روح بھی آپ ہی آپ نکل جائے گی اور اس جہان میں ہم پھر اکٹھے ہوں گے۔ آپ جائیں میں آپ کے راستے میں دیوار نہیں بنوں گی۔ نہ ہی آپ کو جدا کرتے وقت بزدلی کا مظاہرہ کروں گی۔

سلیم وہاں سے بھی مڑا۔ باہر نکلتے ہوئے جب وہ چارہ کترنے والی مشین کے پاس سے گزرنے لگا تو اس کی نظر لکڑی کے دستے والے ایک لوہے کے تیز ٹوکے پر پڑی۔ جھک کر اس نے ٹوکا اٹھایا اور اسے زین سے لٹکاتے ہوئے باہر نکل گیا۔



(۱۵)

گاؤں کے موڑ پر آکر وہ رُکا۔ رائفل اور ریوالور میں گولیاں بھریں تھیلہ جس میں گولیاں تھیں وہ اس نے زین سے کس کر باندھ دیا۔ رائفل کندھے پر ڈالی۔ ریوالور اپنے تہبند کے پلو میں اُڑس کر وہ گھوڑی پر سوار ہونے والا تھا کہ کسی نے زور سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ مارا۔

سلیم نے فی الفور ریوالور نکال لیا اور جونہی اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا وہ حیران رہ گیا۔ سامنے وہی آدم پور کا مفرور اور اشتہاری مجرم نواب کھڑا تھا۔

سلیم نے حیرت سے پوچھا۔

"تم یہاں!"

وہ مسکرا دیا۔

ہاں، میں جانتا تھا تم ضرور اپنے باپو کے قتل کا سُن کر آؤ گے میں تمہاری اور تمہاری ماں کی پوری بات چیت سُن چکا ہوں۔ مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔ اب کدھر جاؤ گے۔

اصل منزل تو چوہدری حاکم کا گھر ہے مگر اس سے قبل میں ان پانچ بدمعاشوں سے نمٹنا چاہتا ہوں جو کبھی میرا ہل روکا کرتے تھے۔

نواب نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر زور سے دبایا۔

تو پھر چلو آج سے تم میرے اور میں تمہارا بازو ہوں۔ دونوں شانے جوڑ کر اس علاقے کے ہر بدمعاش سے غریبوں کے حقوق چھین لینگے۔

دونوں نے گھوڑوں کو ایڑ لگادی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک گھر میں داخل ہوئے۔ اندر وہ شخص جو سلیم کا ہل روکا کرتا تھا اور جس نے اس کے باپو کو قتل کیا تھا بھینس کے آگے چارہ ڈال رہا تھا۔ سلیم کو دیکھتے ہی اس نے اندر بھاگ جانا چاہا مگر سلیم رائفل کا رُخ اس کی طرف کرتے ہوئے زور سے دھاڑا۔

یہیں رُک جاؤ۔ ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو گولیوں سے چھلنی کر دوں گا۔

سلیم نیچے اُترا اور اسے پکڑ کر نواب کے آگے بٹھاتے ہوئے کہا۔

نواب تم اسے قبرستان میرے باپو کی قبر کے پاس لے چلو۔

مَیں دوسروں کو بھی باری باری وہاں لاتا ہوں۔

نواب اسے لے کر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد سلیم بھی وہاں پہنچ گیا۔ وہ ان پانچوں میں سے ایک اور کو بھی اُٹھا لایا تھا۔ اسے بھی نواب کی نگرانی میں دے کر واپس چلا گیا۔

اس طرح سلیم نے اِن پانچوں کو جو اس کا ہل روکا کرتے تھے اور جو اس کے باپو کے قاتل بھی تھے۔ قبرستان میں اپنے باپو کی قبر کے پاؤں کی جانب ایک لائن میں کھڑا کیا اور غصّے میں کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ بتاؤ، تم مجھ پر کیوں ظلم کرتے رہے۔

وہی ان میں سے بڑا بدمعاش جسے سب سے پہلے قبرستان لایا گیا تھا ذرا ہمت کر کے بولا۔

ہم یہ سب کچھ چودھری حاکم کے کہنے پر کرتے رہے۔ ہم مجبور تھے۔

مگر کیوں۔ چودھری حاکم اگر تمہیں کہتا کہ اپنے بھائی کو قتل کر دو تو تم ایسا کر گزرتے۔

وہ خاموش رہا۔

سلیم نے اس کے کندھے پر رائفل کا بٹ مارا۔

بولتے کیوں نہیں۔

وہ درد کی شدت سے بلبلا اُٹھا۔

سلیم پھر چلّایا۔

بولو جواب دو۔ ورنہ یاد رکھو مَیں تمہیں کتّے کی موت ماروں گا۔

اس نے پھر کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

مَیں نے بتایا تو ہے کہ ہم چودھری کے ہاتھوں مجبور تھے۔

کیوں مجبور تھے تم۔

کیا وہ تمہارا خُدا ہے؟

کیا اس کے ہاتھ میں تمہاری زندگی اور موت ہے

کیا وہ تمہارا رازق ہے۔

غریبوں پر ظلم کرنے کے بجائے اگر تم چودھری حاکم کو قتل کر دیتے اور اس جرم میں تمہیں پھانسی بھی ہو جاتی تو لوگ تمہارا نام عزت اور احترام سے لیتے۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

اور تم نے میرے باپو کو کیوں قتل کیا؟

وہ پیلا پڑ گیا مگر رہا چُپ ہی۔

سلیم پھر دھاڑا۔

کچھ بکو، کچھ بولو۔ تمہاری خاموشی خواہ مخواہ میرے غصّے میں اضافہ کر رہی ہے۔

مگر اس نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔

سلیم اور طیش میں آ گیا تھا۔ اس نے زین سے بندھا ہوا لٹھ اُٹھایا اور زور سے گرجا۔ اپنے دونوں ہاتھ آگے کرو۔ جن سے تم نے

میرے باپو کو قتل کیا تھا۔

اس نے دونوں ہاتھ آگے کیے اور سلیم نے اس کے دونوں اپنے ٹوکے سے کاٹ دیئے۔ وہ بڑی بے بسی سے چیخنے چلانے اور سلیم وحشیوں کی طرح قہقہے لگانے لگا۔ تھوڑی دیر تک تو آہ و زاری اور قہقہوں کی ملی جلی آوازوں سے گونجتا رہا پھر سکوت

سلیم پھر اپنا خون آلود ٹوکہ لہراتا ہوا آگے بڑھا اور ان کی گردنیں اپنے ٹوکے سے کاٹ دیں۔ وہ تڑپ تڑپ کر ٹھنڈ ہو گئے۔ سلیم نے ان پانچوں کے سر اٹھا کر اپنے باپو کی قبر پر رکھ اور باقی دھڑ قبر کے اس جانب پھینک دیئے جس جانب اس کے کے پاؤں تھے۔ ٹوکہ پونچھ کر زین سے لٹکاتے ہوئے اس نے نو سے کہا۔

چلو چلیں اب چودھری حاکم کی خبر لیتے ہیں۔

دونوں گاؤں میں داخل ہوئے اور چودھری حاکم کی حویلی باہر گھوڑوں سے اترے۔

سلیم آگے بڑھا اور حویلی کے دروازے پر رائفل کا بٹ ما ہوئے چلا کر کہا۔

دروازہ کھولو چودھری تمہاری موت تمہیں پکار رہی ہے۔

سلیم نے ابھی اتنے ہی الفاظ کہے تھے کہ حویلی کے اوپر مورچہ بنا ہوا تھا اس میں سے گولیوں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ وہاں سے

کوئی پوری قوت کے ساتھ چلایا بھی۔

"دیکھتے ہیں تم کیسے بچ کر جاتے ہو"

حویلی کے صحن سے بھی گولیوں کی سخت باڑھ آنے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بہت سے لوگ پہلے ہی سے وہاں جمع ہوئے بیٹھے ہوں۔

نواب نے فوراً سلیم کا بازو پکڑ کر دیوار کی اوٹ میں بٹھا لیا۔

آڑ لے لو۔ یہاں شاید پہلے ہی سے بہت سے لوگ جمع ہیں۔ اندر جانے کے بجائے اب یہاں سے بچ نکلنے کی ترکیب سوچو۔ ہم ہر طرف سے چھت والے مورچے کی زد میں ہیں۔

سلیم دیوار کی آڑ لے کر پھر کھڑا ہو گیا۔

ٹھہرو میں ان کا بندوبست کرتا ہوں۔

اس نے دستی بم نکالا اور پن علیحدہ کر کے تاک کر اس مورچے پر مارا۔ ایک زوردار دھماکہ ہوا اور مورچے کے پرخچے اڑ گئے۔ اس میں چھپے ہوئے بدمعاشوں نے ادھر ادھر بھاگنا چاہا مگر سلیم اور نواب نے انہیں اپنی گولیوں کی باڑھ پر رکھ کر ختم کر دیا۔

سلیم نے ایک اور دستی بم کا پن نکالا اور حویلی کے صحن میں پھینک دیا۔ وہاں بھی ایک زبردست دھماکہ ہوا اور کھلبلی سی مچ گئی۔ سلیم اور نواب اسی افراتفری کے عالم میں وہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔

سلیم اپنے گھر داخل ہوا اور نواب باہر ہی کھڑا رہا۔ گلشن اور کشور

کے قریب آکر اس نے کندھے پر رائفل درست کرتے ہوئے کہا۔

ماں ! مَیں نے ان پانچ بدمعاشوں کو جو میرا ہل روکا کرتے تھے، اور جنہوں نے میرے باپو کو قتل کیا تھا، ختم کر دیا ہے۔ مَیں ان کے سر کاٹ کر اپنے باپو کی قبر پر رکھ آیا ہوں۔

گلشن کچھ غمزدہ سی ہو گئی

سلیم پھر بولا۔

ماں ! تم اس جہاں میں بھی اور حشر کے روز بھی میری گواہ رہنا کہ مَیں بدمعاش، چور، ڈاکو، مجرم اور گنہگار نہیں تھا۔

حالات نے مجھے اس طرف کھینچا ہے۔

وقت نے مجھے اس سمت پہنچا دیا ہے۔

اس ظالم دُنیا والوں نے مجھے قاتل اور مجرم بننے پر مجبور کیا۔

سو ماں ! تم گواہ رہنا اس جہاں میں بھی اور اس جہان میں بھی تم دونوں فکر نہ کرنا۔ مَیں ملتا رہوں گا۔ آدم پور کا نواب میرا بھائی بن گیا ہے۔ میں اس کے ساتھ جا رہا ہوں۔

سلیم باہر نکل گیا۔

کشور اور گلشن اسے حسرت سے دیکھتی رہ گئیں۔



(۱۶)

سلیم کے ساتھ نواب اپنے گاؤں آدم پور آیا۔ گاؤں میں داخل ہونے کے بجائے وہ باہر ہی باہر آگے نکل گیا۔ ذرا آگے جا کر اینٹیں پکانے کا ایک بھٹہ آ گیا تھا جس کے قریب ہی خانہ بدوش لوگ نرسل کی جھونپڑیوں میں آباد تھے۔

ان کے زیادہ تر مرد اور عورتیں بھٹے پر اینٹیں بنانے کا کام کرتے تھے۔ کچھ عورتیں گاؤں گاؤں گھوم پھر کر چوڑیاں بھی بیچتی تھیں بعض مرد گلی گلی اور قریہ قریہ ریچھ اور بندر کا تماشہ بھی دکھاتے تھے۔

نواب جب ان جھونپڑیوں میں داخل ہوا تو کیا عورتیں اور کیا

مرد اس کے گرد جمع ہوگئے اور اس کی خیریت معلوم کرنے لگے۔ ان کا
نواب کے ساتھ ایسے ہی تھا جیسے کسی محبوب لیڈر کے ساتھ اس
شیدائی رعایا کا۔

نواب نے ان سب سے سلیم کا بھی تعارف کرایا۔ وہ سلیم
بھی جھک جھک کر سلام کرنے لگے تھے۔

خانہ بدوشوں کی اس بستی سے نکل کر دونوں بھٹے کی اینٹو
بنی ہوئی چمنی کے پاس آئے۔ وہاں جگہ جگہ کوئلہ ڈالنے کے لیے سو
بنے ہوئے تھے اور ہر سوراخ پر لوہے کا ڈھکن تھا۔

نواب نے ایسے ہی ایک سوراخ کا ڈھکن اٹھایا۔ وہاں آگ
نہیں جل رہی تھی۔ سلیم کو اپنے پیچھے پیچھے آنے کا کہہ کر نواب اس سو
میں اتر گیا۔ نیچے جا کر وہ زمین پر لیٹ گیا اور آہستہ آہستہ دائیں جانب
رینگنے لگا۔

سلیم بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ کوئی دو گز کا فاصلہ انہو
نے رینگ کر طے کیا اور پھر دونوں کپڑے جھاڑتے ہوئے کھڑے ہوگئے

اب ان کے سامنے ایک کمرہ تھا۔ جس کا لکڑی کا دروازہ
تھا۔ دونوں اس کمرے میں داخل ہوگئے۔ نواب نے مسکراتے ہو
کہا۔ " یہ ہے اپنی پناہ گاہ۔

سلیم نے بھی تعریف کی۔

بہت محفوظ جگہ ہے۔

نواب سلیم کو ساتھ لے کر پھر سوراخ کے منہ میں آیا اور دھوئیں کی
نی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

اس چمنی کے ساتھ لگی ہوئی تمہیں کوئی نمایاں چیز دکھائی دیتی ہے۔

سلیم فوراً بول پڑا۔

ہاں کپڑے کی ایک ہری جھنڈی لگی ہوئی ہے۔

بہت عقلمند ہو۔ جب اس چمنی کے ساتھ ہری جھنڈی ہے، تو
ر باہر نکلنے میں کوئی خطرہ نہیں اور جب چمنی کے ساتھ سرخ جھنڈی ہو
وقت خطرہ ہوتا ہے لہذا باہر نہیں نکلنا چاہیئے۔ اور جب زیادہ ہی
رہ ہو اور پولیس بھٹے کے علاقے میں ہی ہماری تلاش میں ہو تو اس وقت
ٹے پر کام کرنے والے مزدور اپنے دوسرے ساتھیوں کو زور زور سے
نے لگیں گے۔

کوئلہ ڈالو کوئلہ۔ ایسی صورت میں خطرہ زیادہ ہوتا ہے اور اس
راخ میں بھی نہیں آنا چاہیئے۔ نہ ہی اس کا ڈھکن کھلا رکھنا چاہیئے۔
ہ اس تہ خانے میں بند ہو جانا چاہیئے۔ بھٹے کا مالک میرا اپنا آدمی ہے
لیے یہاں کوئی خطرہ نہیں۔

دونوں پھر تہ خانے میں آئے۔ فرش پر ایک چٹائی پر بستر لگا ہوا
ایک کونے میں جلی ہوئی لکڑی کے کچھ کوئلے بھی بکھرے پڑے تھے
م نے کمرے کی دیواروں اور چھت کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

یہ لوگ قابلِ اعتماد ہیں۔

نواب اس کے قریب آگیا۔

حد سے زیادہ۔ ہماری خاطر وہ اپنی جان دینے سے بھی در
نہ کریں گے۔

سلیم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

میں تمہارا ممنون ہوں کہ تم نے مجھے پناہ دی۔ ورنہ اس ظالم بے رحم دُنیا نے میں کون کسی کو پوچھتا ہے۔ سب مطلب نکالتے اور چلے جاتے ہیں۔

نواب نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

تم میرے بھائی ہو۔

میرا تمہارا اب موت تک سنگ ہے۔ بالکل ایسے——
جیسے دو بیل ایک جوئے میں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔
ریل کی دونوں پٹریاں ایک ہی سمت متوازی بھاگتی ہیں۔
بیسیوں کونجیں ایک سے ایک پہلو مِلا کر اُڑتی ہیں۔
ویسے ہی جیسے
چاند کے ساتھ ہمہ وقت وہ چمکتا ہوا ستارہ رہتا ہے۔
رات کے وقت تین ستارے ایک سے ایک پہلو ملا کر سفر
اسی طرح جس طرح
انسان کے ساتھ اس کا سایہ
پانی کے ساتھ کنارہ۔

ہاں بالکل ایسے ہی میرا تمہارا ساتھ ہوگا۔

سلیم نے کونے میں پڑا ہوا ایک بڑا سا کوئلہ اُٹھایا اور سامنے والی دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

آج سے یہ دیوار ہماری ڈائری کا کام دے گی۔

اس نے دیوار پہ ایک کا ہندسہ ڈالا اور اس کے سامنے چودھری حاکم اور اس کے دونوں بیٹوں اشرف اور اختر کے نام لکھ دیئے پھر دو کا ہندسہ لکھا اور اس کے سامنے مرالہ کے بدمعاش برکت کا نام لکھ ڈالا اسی طرح تین کے ہندسے کے سامنے چودھری حاکم کا داماد شفیع کا نام لکھنے کے بعد اس نے نواب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

فی الحال تو ہمیں ان سے نمٹنا ہے۔

نواب آگے بڑھ آیا۔

نہیں۔ ان کے علاوہ بھی بہت ہیں۔ ان کے نام میں لکھتا ہوں تم ان کے نیچے لکھو۔

نواب نے چار نام اور بتائے جو سلیم نے ان کے نیچے لکھ دیئے۔
اب ہندسے سات تک چلے گئے تھے۔ نواب نے غصے میں کہا۔ یہ سب قریبی گاؤں کے بدمعاش ہیں۔ انہوں نے ہم جیسے غریبوں کا جینا محال کر رکھا ہے۔

نواب جذباتی ہو گیا۔

یہ غریبوں کے مُنہ سے نوالہ چھینتے ہیں۔

بھیڑیوں کی طرح ان کا خون پیتے ہیں۔
پتھر سمجھ کر انہیں ٹھوکر مارتے ہیں۔
خشک پتے سمجھ کر پاؤں تلے مسلتے ہیں۔

یہ انہیں تھپکیاں دے دے کر سلائے رکھتے ہیں۔ انہیں بیدار نہیں ہوتے دیتے کہ کہیں ان کے مقابل نہ آن کھڑے ہوں۔ انہیں نئی روشنی سے آگاہ نہیں ہونے دیتے کہ کہیں ترقی نہ کر پائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ ان کے کھیت بھی سو جاتے ہیں۔ وہ بھی جاگ نہیں پاتے اور ساتھ ہی ان کی تقدیر بھی سو جاتی ہے۔

میں آج تک اکیلا ان سے انتقام نہ لے سکا۔ اب ہم دو بھائی اور چار بازو ہیں۔ ایک ایک سے ان کے گناہوں اور مظالم کا محاسبہ کریں گے۔ ——— سلیم کی مٹھیاں سختی سے بند ہو گئیں اور وہ بھی جذباتی ہو گیا۔

تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ یہی لوگ ہیں۔
جو ہمارے معاشرے کی گندگی ہیں۔
یہی لوگ ہیں جو غریب کسانوں کے جسم پر خون پینے والی گندی جونکیں ہیں۔

یہ شیطان، یہ بھیڑیے۔
یہ پاپی، یہ گناہ گار۔
ہم ان کے دراز ہاتھ کاٹ دیں گے۔ ہم غریب کسانوں کو بیدار کریں گے اور اس کے ساتھ ہی ان کے کھیت بھی جاگ اٹھیں گے۔ کوئی ان

ل روکنے والا نہ ہو گا۔ کوئی ان پہ ظلم ڈھانے والا نہ ہو گا۔ وہ آزاد اور اپنی مرضی کے مالک ہوں گے۔ بالکل ایک عام اور معزز شہری کی مانند۔

نواب نے بھی تائید کی۔

ضرور۔
کسان بیدار ہوں گے۔
کھیت جاگیں گے۔

کمرے میں تھوڑی دیر کے لیے سکوت چھا گیا۔ پھر نواب کی تجسس آمیز آواز سنائی دی۔

ان سات فرائض میں سے بسم اللہ کس سے کریں۔
سلیم کا سر جھک گیا۔
ان دو آدمیوں پر مشتمل قافلے کے آج سے تم سردار ہو۔
تم رہبر ہو، تم ہی رہنما ہو۔ تمہارا فیصلہ آخری فیصلہ ہوا کرے گا تم مجھے جس طرف بھی اشارہ کرو گے اسی طرف ہی میں بڑھوں گا۔
نواب نے اس کا گھٹنا پکڑ لیا۔
نہیں ہرگز نہیں۔ تم مجھ سے طاقت ور ہو، مجھ سے زور آور ہو۔ قافلہ، قبیلہ یا کاروان خواہ دو آدمیوں پر مشتمل ہو یا ہزاروں اور لاکھوں پر، سردار وہی ہو گا جو شاہ زور ہو گا۔
تم مجھ سے عمر میں بھی تو بڑے ہو۔
اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

بہر حال اس مہم کا سارا پروگرام تمہیں ہی مرتب کرنا ہوگا۔

وہ تو میں کر لوں گا۔

تو پھر بولو کہاں سے شروع کریں۔

چودھری حاکم اور اس کے بیٹوں سے اگلے دو ہفتوں کے دوران ٹکرانا بے وقوفی ہوگی۔ کیوں کہ ایک تو ہم نے وہاں پانچ قتل کر دیے ہیں اور چودھری کے گھر پر بھی حملہ کیا ہے۔ اس کے نتیجے میں لازمی ہے، کہ وہاں کچھ عرصہ تک پولیس رہے گی۔ لہٰذا ادھر کا رُخ کرنا خطرناک ہے یہی حالت چودھری کے داماد شفیع کی بھی ہوگی اس نے بھی احتیاطی تدابیر اختیار کر لی ہوں گی۔

پھر کیا کریں۔

مرالہ کے بدمعاش برکت پر ہاتھ ڈالتے ہیں۔ گو وہ اس علاقے کا سب سے بڑا بدمعاش اور اثر رسوخ والا آدمی ہے۔ اس کے علاوہ اس کے ساتھ اور بہت سے مفرور اور قاتل بھی ہیں۔ پھر بھی ہمیں اپنی مہم کا آغاز تو کرنا ہے اور کرنا بھی اسی پر ہے۔ خطرات سے مُنہ پھیرنا مردوں کا شیوہ نہیں۔ رہا سوال اس پر حملہ آور ہونے کے طور طریقہ کا تو اس کے متعلق سوچنا تمہارا کام ہے۔

غصے میں سلیم کا رنگ سرخ ہو گیا۔

ضرور، میں ضرور سوچوں گا۔ میں اسے بتاؤں گا کہ میرا انتقام کتنا بھیانک ہے۔

میں ثابت کر دوں گا کہ ایک امن پسند شہری کو بھی جب حد سے زیادہ تنگ کیا جائے تو وہ بھی ایک طوفان بن کر اُٹھ سکتا ہے اور سینہ سپر ہو کر اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیتا ہے۔

وہ کہیں کھو گیا۔

ہاں ایک طوفان اُٹھے گا۔

بھیانک طوفان۔

تم بستی والوں سے کہہ کر پولیس کے ایک انسپکٹر، ایک ہیڈ کنسٹیبل اور دو سپاہیوں کی وردیوں کا انتظام کرو اور انہیں کہنا دو نڈر قسم کے جوانوں کا انتخاب بھی کر کے رکھیں جو اس مہم میں ہمارے ساتھ ہوں گے۔

نواب نے حیرت سے پوچھا۔

وردیوں کا کیا کرو گے۔

تم مجھ پر اعتماد رکھو، میں کوئی غلط قدم نہ اُٹھاؤں گا۔

وہ تو مجھے ہے ہی۔

تو پھر تم سارا انتظام مکمل کرو۔ مہم پر روانہ ہونے سے قبل میں تمہیں سب کچھ سمجھا دوں گا۔

اِتنے میں باہر سوراخ کے ڈھکن پر کھٹکا ہوا۔ سلیم چونک گیا۔ اور اپنا ریوالور نکال لیا۔

کون ہے؟ اس نے نواب سے پوچھا۔

نواب زور سے چلّایا۔

کون ؟

باہر سے آواز آئی ۔

میں شوکت ہوں ۔

کون ہے یہ ؟ سلیم نے پھر پوچھا ۔

بستی والے کھانا لائے ہیں ۔

نواب اُٹھا اور کھانا لانے کے لیے باہر نکل گیا ۔



(۱۷)

سُورج غروب ہو رہا تھا ۔ اُجالے جھلملانے لگے تھے ۔ اندھیرے تاک جھانک کر رہے تھے ۔ ڈوبتے سُورج کی سنہری کرنیں چناب کے پانی کو بھی خُونی بنا رہی تھیں ۔ چاند آسمان پر مسکرانے لگا تھا ۔ کوئی کوئی تارہ بھی ہنستا دکھائی دے رہا تھا ۔

پولیس کا ایک انسپکٹر، ایک ہیڈ کنسٹیبل اور دو سپاہی کلف لگی ہوئی چمک دار اور صاف ستھری وردیوں میں مرالہ گاؤں میں داخل ہوئے ۔ انسپکٹر سلیم تھا، ہیڈ کنسٹیبل نواب اور سپاہی خانہ بدوشوں کی بستی کے دو ہٹے کٹے جوان تھے ۔

پنچائت گھر میں چاروں آ کر رک گئے۔ قریب ہی گزرتے ہوئے ایک شخص کو سلیم نے چوکیدار کو بلانے کے لیے کہا اور پھر چاروں پنچایت گھر میں پڑی ہوئی چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔

تھوڑی دیر بعد چوکیدار آ گیا اور جھک کر سلام کرنے کے بعد اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

حکم جناب!

سلیم نے آواز میں مصنوعی سختی پیدا کر لی۔

برکت کو بلاؤ۔

چوکیدار برکت کو بلا لایا۔ وہ دوہرے جسم کا تیس سال کے لگ بھگ ایک مضبوط اور آہنی جسم کا جوان تھا۔

سلیم نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا اور اپنے پاس ہی بٹھا لیا۔

برکت نے سلیم کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

آپ ہمارے تھانے میں نئے تو نہیں آئے، پہلے کبھی میں نے آپ نہیں دیکھا۔

سلیم نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

میں اس تھانے سے نہیں شہر سے آیا ہوں۔ ایک نیا ایس پی تبدیل ہو کر آیا ہے۔ اس علاقے میں چونکہ بدمعاشوں کا آج کل بہت زور ہے اس لیے حالات کا جائزہ لینے کے لیے اس نے تمہیں بلایا ہے۔ پہلا ایس پی تمہاری تعریف کر کے گیا تھا۔ لہٰذا نئے ایس پی نے بھی تم پر اعتماد کا اظہار

کیا ہے اور تمہیں شہر بلایا ہے تاکہ تمہارے ساتھ بات چیت کر کے اس علاقے کے امن کو سدھارنے اور بہتر بنانے کے انتظامات کیے جائیں۔ انتظامیہ تمہاری کارکردگی سے بے حد خوش ہے۔ تم ایک معزز شہری اور حبِ وطن جوان ہو، بدمعاشوں کو پکڑنے کے لیے تم بہت کچھ کر سکتے ہو۔

برکت اپنی تعریف سن کر پھول گیا اور مونچھوں کو اوپر کی جانب تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

بدمعاش تو انسپکٹر صاحب اس علاقے میں میں نے رہنے ہی کوئی نہیں دیا۔ صرف دو بدمعاش رہ گئے ہیں۔

ایک تو نواب ہے بہت پرانا اور عیار بدمعاش ہے۔ اس کے ٹھکانے کا پتہ لگانے کے لیے میں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے مگر ابھی تک کامیاب نہیں ہوا۔ بہرحال میں مایوس نہیں۔ میں اسے بھی ڈھونڈ نکالوں گا اور اس کا سر قلم کر کے انتظامیہ کو پیش کر دوں گا۔ یہ بدمعاش اب تک پندرہ قتل کر چکا ہے۔ ہے بھی اکیلا ہی مگر سانپ کی مانند تیز اور لومڑی مواقف عیّار ہے۔

دوسرا ایک نیا بدمعاش اٹھا ہے۔ اس کا نام سلیم ہے۔ یہ پہلے بدمعاش سے بھی زیادہ خطرناک دکھائی دیتا ہے۔ اس نے ایک ہی رات پانچ قتل کر کے اس علاقے میں کہرام مچا دیا ہے۔ اب سنا گیا ہے کہ یہ دونوں بدمعاش اکٹھے ہو گئے ہیں اور ان کا اکٹھا ہونا بعید

خطرناک ہے۔

سلیم نے لاپروائی سے کہا۔

"کوئی خطرہ نہیں"

نہیں جی، بہت خطرہ ہے، دیکھیں ناجہاں دو دریا ملتے ہیں جہاں دو انگلیاں ملتی ہیں جہاں دو معمولی دھاگے بھی آپس میں ملتے ہیں، وہاں ضرور کوئی تبدیلی ہوتی ہے اور ان کی قوت میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہو جاتا ہے۔

سلیم نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔

تم ٹھیک کہتے ہو۔ اب تم تیاری کرو اور چلو ہمارے ساتھ۔

نہیں ابھی کیسے جائیں گے آپ، رات یہاں آرام کریں گے۔ صبح تڑکے ہی چل نکلیں گے۔

نہیں، نہیں ہمیں ابھی جانا ہے۔ رات ہم پولیس ہیڈ کوارٹر کی لائنوں میں ہی جا کر آرام کریں گے۔ ایس پی کا حکم ہے کہ وہ کل صبح سویرے سب سے پہلے تم سے ہی ملنا چاہتے ہیں۔

تو پھر ذرا ٹھہریں تو آپ لوگوں کے کھانے کا انتظام تو کر دوں۔

اس کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ کھانا ہم سگر کے چودھری حاکم کے ہاں سے کھا کر آئے ہیں۔

برکت کھڑا ہو گیا۔

تو پھر مجھے اجازت دیں میں تیار ہو کر فوراً آتا ہوں۔

برکت ابھی چند قدم ہی بڑھا تھا کہ نواب پہلی بار بولا۔

چودھری! سنا ہے تمہارے پاس ایک ایسی زین ہے جس کے آگے اور پیچھے لوہے کی ایسی پلیٹیں لگی ہوئی ہیں جن پر گولی کوئی اثر نہیں کرتی ہے۔

برکت پھر واپس آ گیا۔

جی ہاں، ہے میرے پاس وہ میں نے ایک لوہار سے بڑی محنت کے ساتھ بنائی تھی۔ ہر گھوڑا اور گھوڑی سوار کے ساتھ اس زین کا وزن برداشت نہیں کر سکتا ہے۔ میرے پاس ایک ایسا گھوڑا ہے جو شاید آپ لوگوں نے کبھی دیکھا تک نہ ہو۔ یہ گھوڑا اس زین کے ساتھ دو سوار بھی اپنی پیٹھ پر لیے ہوا کی طرح دوڑتا ہے۔

اس بار سلیم بولا۔

یہ دونوں چیزیں ساتھ لے لینا۔ ایس پی اسے دیکھنا پسند کریگا۔ اس کے علاوہ بھی تمہارے پاس کوئی ایسا گھوڑا ہے جو اس زین کا بوجھ برداشت کر سکے۔

ضرور ہے جی اور ویسی ہی ایک اور زین بھی ہے۔

تو پھر دونوں گھوڑے ان زینوں کے ساتھ لے آنا۔

ٹھیک ہے جی، وہ واپس مڑا مگر رکا اور پھر بولا۔

میرے دو محافظ ہیں۔ اگر آپ لوگوں کی اجازت ہو تو میں انہیں بھی ساتھ لے لوں۔

ضرور، ضرور، سلیم نے کھڑے ہوتے ہوئے اجازت دی۔

برکت نے زیادہ دیر نہ لگائی تھی۔ جلدی ہی وہ واپس آگیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے دو محافظ بھی تھے۔ ایک گھوڑے پر وہ خود سوار تھا اور دوسرے پر اس کے دونوں محافظ۔

گھوڑے دونوں ہی گہرے سرخ رنگ کے تھے۔ ان پر جو زینیں تھیں ان کے سامنے اور پیچھے لوہے کی ایسی پلیٹیں نصب تھیں جن کے درمیان سامنے اور پیچھے سے ان پر بیٹھنے والا تقریباً چھپ جاتا تھا۔

ان کو دیکھتے ہی وہ چاروں بھی سوار ہو گئے۔ نواب اور ایک ساتھی آگے آگے لگ گئے اور سلیم اور دوسرا ساتھی ان کے پیچھے ہو لیے کچھ دیر تک وہ شہر کی جانب جانے والے راستے پر چلتے رہے پھر نواب اور اس کا ساتھی بائیں طرف دریا کی سمت مڑ گئے۔

برکت نے اپنے پیچھے سلیم کی طرف دیکھتے ہوئے اعتراض کیا۔

ادھر کدھر جا رہے ہو۔

سلیم نے اس کی تسلی کرنا چاہی۔

ہمارے کچھ ساتھی دریا کے کنارے ہمارا انتظار کر رہے ہیں ہمیں انہیں بھی ساتھ لینا ہے۔

برکت اپنے ساتھیوں کے ساتھ رک گیا۔

میں اس طرف نہیں جاؤں گا۔ سیدھے شہر کی طرف چلتے ہو تو چلو، ورنہ میں واپس جاتا ہوں۔

نواب اس کا گہری نگاہوں سے جائزہ لینے لگا تھا۔

اس کے دونوں ساتھی بھی مستعد ہو گئے تھے۔

برکت اور اس کے ساتھی بھی شاید خطرے کی بو پا گئے تھے۔ ان کی نگاہیں بھی تیز ہو گئی تھیں اور حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ان کے ہاتھ اپنے اپنے ہتھیاروں پر جا جمے تھے۔

سلیم نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور برکت کو مخاطب کیا۔

تم تو یونہی ہم پر شک کرنے لگے ہو۔

پھر اس کے نواب کی طرف دیکھا

چلو بھائی سیدھے ہی چلو۔ ساتھ ہی اس نے ہوا میں اپنی پانچ انگلیاں بھی لہرا دیں۔

برکت اور اس کے محافظ مطمئن ہو گئے اور انہوں نے اپنے اپنے ہتھیاروں سے ہاتھ اٹھا لیے۔ گھوڑوں نے جونہی پانچ قدم آگے بڑھائے نواب تیزی سے پلٹا اور شاہین کی مانند برکت پر جھپٹ پڑا۔ اسی لمحہ سلیم نے چیتے کی سی تیزی سے جست لگائی اور برکت کے دونوں محافظوں کو گھوڑے سے نیچے گرا کر ان پر سوار ہو گیا۔ ان کے دونوں ساتھی بھی ویسی ہی تیزی اور پھرتی سے آگے بڑھے اور ان تینوں سے ہتھیار چھین کر اپنے قبضے میں کر لیے۔ پھر انہوں نے تینوں کے ہاتھ اور منہ باندھے اور گھوڑوں پر سوار کر کے وہ انہیں دریا کنارے لے آئے۔

گھوڑوں سے اتر کر انہوں نے برکت اور اس کے ساتھیوں سے ہاتھ اور منہ کھول دیئے۔ برکت نے قہر آلود نگاہوں سے سلیم کی

طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

کون ہو تم؟ میرے ساتھ یہ مذاق تمہیں مہنگا پڑے گا۔

سلیم نے طنز کے انداز میں سر جھکا کر کہا۔

میرا نام سلیم ہے

برکت اور اس کے ساتھی پریشان ہو گئے۔

نواب نے بھی ٹھوکر لگائی۔

اتنی جلدی ہی کیوں گھبرا گئے ہو۔ پہلے میرا نام بھی تو پوچھو۔

برکت نے پھر غصے میں جواب دیا۔

تم یقیناً نواب ہو۔

سلیم پھر ان کی باتوں میں حائل ہو گیا۔

تم نے میرے بھائیوں کو کیوں قتل کیا جب کہ انہوں نے تمہارے پاس پناہ لی تھی۔ کس جرم میں تم نے ان کے سر کاٹ کر پولیس کے حوالے کر دیئے اور انعام کی رقم وصول کر لی۔

برکت انکار کر گیا۔

میں نے تمہارے بھائیوں کو قتل نہیں کیا۔

سلیم نے زین سے ٹوکا اتار لیا اور لہراتا ہوا اس کے قریب آیا۔

سچ سچ کہہ دو ورنہ اسی ٹوکے سے تمہارے چھتیس ٹکڑے کر دوں گا۔

برکت کانپ گیا اور فوراً مان گیا۔

بے شک میں نے تمہارے بھائیوں کو قتل کیا ہے مگر میں اس طرح بزدلی کی موت نہیں مرنا چاہتا۔ تم دونوں میں سے جو چاہے میرے سامنے اکیلا اکیلا آجائے۔ میں اگر ہار گیا تو میرے ٹکڑے کر دینا اور اگر میں جیت گیا تو میں تم سے اس سلوک کی توقع رکھوں گا جو ایک بہادر بہادر سے کرتا ہے۔

سلیم نے ٹوکا دوبارہ زین سے لٹکا دیا۔

مجھے تمہاری شرط منظور ہے۔

نواب بھی آگے بڑھ آیا۔

ٹھہرو سلیم! اس کالے لومڑ سے میں نمٹتا ہوں۔

سلیم نے اسے ایک طرف ہٹا دیا۔

نہیں نواب! یہ میرے بھائیوں کا قاتل ہے اس کے ہاتھوں میں میرے ہی ہاتھ جائیں گے۔

برکت آگے بڑھا۔

سلیم نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔

ٹھہرو! مجھے یہ وردی اتار لینے دو۔ اس میں لڑنا وردی کی توہین ہے۔

سلیم اور نواب دونوں نے وردیاں اتار دیں اور زین سے بندھے ہوئے اپنے دوسرے کپڑے پہن لیے اس کے ساتھ ان کے دونوں ساتھیوں نے بھی اپنے کپڑے تبدیل کر لیے۔

سلیم اور برکت دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھے بھوکے

چیتوں کی مانند وہ چند لمحوں تک ایک دوسرے کو گھورتے رہے پھر آپس میں مکوں کی بارش کر دی۔

لگاتار تین چار منٹ تک وہ کھڑے ہو کر لڑتے رہے۔ پھر —— پھر برکت نے اپنا دایاں پاؤں لہرا کر سلیم کے گھٹنے پر مارا اور اس کے ساتھ ہی اپنا دایاں ہاتھ پوری قوت کے ساتھ اس کی گردن پر جڑ دیا۔

سلیم جھکا کر زمین پر اوندھے منہ گر گیا۔ برکت پھر اس پر جھپٹا اپنے دونوں گھٹنے سلیم کی پیٹھ پر جمانے کے بعد اس نے اپنے دونوں بازو سلیم کی بغلوں میں سے نکالتے ہوئے دونوں ہاتھوں کی اس کی گردن پر کنگھی بنائی اور پھر زور زور سے اس کا سر زمین پر پٹخنے لگا۔

سلیم عجیب سے شکنجے میں پھنس گیا تھا مگر اس نے ہمت نہ ہاری۔ آہستہ آہستہ اس نے اپنے دونوں گھٹنے سمیٹ کر دُہرے کرنے شروع کر دیئے۔ برکت نے اسے اس سے باز رکھنا چاہا مگر کامیاب نہ ہوا۔

دونوں گھٹنے دُہرے کرنے کے بعد سلیم نے سر نیچے جھکا کر پیٹھ کو اُوپر اُٹھایا۔ برکت نے ایک زوردار گھٹنا مار کر پھر اسے سیدھا کرنا چاہا مگر اسی لمحہ سلیم نے اپنے دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھا کر برکت کی گردن کو جکڑ لیا۔

پھر اس نے پوری قوت کے ساتھ برکت کا سر نیچے کی سمت کھینچتے ہوئے اُوپر اُٹھنا شروع کر دیا۔ جونہی وہ تھوڑا سیدھا ہوا برکت لہرا کر اس

کے سامنے آ گرا، مگر فوراً ہی پاؤں پر کھڑا ہو کر سنبھل گیا۔

دونوں پھر ایک دوسرے کو گھونسے مارنے لگے۔ ایک موقع پر جب برکت نے سلیم کی گردن پر ایک آہنی گھونسہ مارا سلیم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر زور سے آگے کھینچا۔ برکت اپنا توازن کھو گیا اور آگے کو جھک گیا سلیم نے موقع سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔ اور دائیں ہاتھ کی کہنی خوب زور سے اس کی پیٹھ پر دے ماری۔

برکت دوہرا ہو گیا اور جھکتا ہوا پانی میں جا گرا سلیم نے وہیں سے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور اس کے اُوپر چڑھ بیٹھا۔ برکت نے بچ نکلنے کی پوری کوشش کی مگر ناکام رہا اور سلیم نے پانی کے اندر ہی اسے مار مار کر نڈھال کر دیا۔

پھر وہ اس کا گریبان پکڑ کر کھینچتا ہوا باہر لایا اور ریت پر لٹا دیا برکت پر بُری طرح درماندگی طاری تھی اور وہ ہانپ رہا تھا۔

سلیم نے اس کے بال پکڑ کر جھنجھوڑے۔

تم نے آج تک کتنے بے گناہوں کا خون کیا ہے۔ سچ سچ کہنا ورنہ بڑی بُری موت ماروں گا۔

اٹک اٹک کر برکت نے جواب دیا۔

قتل تو بہت کیے ہیں مگر بے گناہ بارہ ہی قتل کیئے۔

سلیم نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

شاباش۔

اور کتنے غریبوں کے گھر لوٹے۔

برکت بے ساختہ رہا۔

آٹھ۔

سلیم نے حساب لگایا۔

بارہ اور آٹھ بیس۔

اور کتنی معصوم لڑکیوں کی عزّت لُوٹی۔

گیارہ

بیس اور گیارہ اکتیس۔

سلیم غصے میں بھر گیا پھر اس نے ٹوکا اُٹھایا اور برکت کو ریت پر سیدھا لٹا کر ٹوکے سے اس کا جسم اکتیس ٹکڑوں میں کاٹ دیا۔

ریت پر خون ہی خون ہو گیا تھا۔

سلیم نے اس کے ایک محافظ کی چادر لی اور لاش کے اکتیس ٹکڑے اس چادر میں باندھنے کے بعد اس کے ان دونوں محافظوں سے کہا۔ یہ اُٹھا کر اس کے گھر لے جاؤ تاکہ اس کے بھائیوں اور رشتہ داروں کو نصیحت ہو جائے اور کوئی بھی اس جیسی راہ اختیار نہ کرے۔ اور یہ بھی یاد رکھو، تم دونوں کو میں چھوڑ رہا ہوں۔ تم نے اگر کبھی بھی میرے خلاف محاذ آرائی کی کوشش تو یاد رکھنا تم دونوں کا حشر اس سے بھی بُرا ہو گا۔

دونوں محافظ لاش اُٹھا کر اندھیرے میں غائب ہو گئے۔

سلیم اور نواب برکت کے دونوں گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ باقی گھوڑے ان کے ساتھیوں نے سنبھال لیے اور دریا سے ذرا ہٹ کر وہ کچّے راستے پر آدم پور کی طرف بڑھنے لگے۔



(۱۸)

سلیم اور نواب اپنے گھوڑے سرپٹ دوڑاتے ہوئے آدم پور سے چاندی کوٹ کی طرف جا رہے تھے۔ دوپہر خوب گرم ہو گئی۔ چلچلاتی دھوپ ہر چیز کو جھلسا دینے کا تہیہ کیے ہوئے تھی۔

چاندی کوٹ سے ذرا باہر ہی ایک کسان کیکر کی چھدری چھاؤں میں بیٹھا اور اس کی بیوی یا بہن اسے کھانا کھلا رہی تھی۔

ذرا دائیں جانب بے شمار بھیڑیں کیکر کے ایک بہت بڑے درخت کے نیچے ایک دوسری کے ساتھ اس طرح سر جوڑے کھڑی تھیں جیسے آپس میں کوئی صلاح مشورہ کر رہی ہوں۔ ان دونوں کے درمیان ایک بوڑھا بیری کے ایک چھوٹے سے درخت پر اپنی چادر ڈال کر سایہ

کیا ہوا تھا اور اس کے نیچے بیٹھا نہ جانے ماضی کی کن یادوں میں گم تھا۔ وہ اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے نرم زمین پر طرح طرح کے نقوش بنا رہا تھا۔ اس کے سامنے اس کی بھینس پانی کی ایک چھوٹی سی کھڈ کے اندر کیچڑ میں لوٹ رہی تھی۔

بائیں جانب ذرا دور کچھ لوگ آپس میں جھگڑا کر رہے تھے۔ ان دونوں نے اپنے گھوڑے اسی جانب چھوڑ دیے۔ جب وہ قریب پہنچے تو عجیب سا منظر تھا۔ دو ہٹے کٹے اوپر اٹھی ہوئی مونچھوں والے بدمعاش قسم کے جوان ایک عورت سے جھگڑا کر رہے تھے۔

عورت چھبیس ستائیس برس کی خوب صورت، پرکشش اور باوقار سی شخصیت کی مالک تھی۔ اس کے قریب ہی دو بچے کھڑے تھے۔ ایک دس برس کے قریب ہوگا اور دوسرا پانچ برس کا ہوگا۔ وہ دونوں رو رہے تھے شاید اس عورت کے بیٹے تھے۔

سلیم اور نواب ان سے ابھی تھوڑی دور ہی تھے کہ ایک مرد نے لگاتار کئی طمانچے عورت کے منہ پہ دے مارے۔ وہ بیچاری چکرا گئی اور بے بسی کے عالم میں چیختی ہوئی زمین میں گر گئی۔ دونوں بچے زور زور سے رونے لگے تھے۔

اتنے میں وہ دونوں بھی ان کے قریب آکر رک گئے۔

عورت کھڑی ہوئی اور روتی ہوئی آواز میں کہا۔

ایک بے بس اور مجبور عورت پر ہاتھ اٹھانا آسان ہے۔ اپنے جیسے کسی مرد سے جھگڑا کرو تو تمہیں بتائے کہ ہاتھ کیسے اٹھتا ہے۔

اس نے بڑی بدتمیزی سے جواب دیا۔

جاؤ بلا لاؤ کسی خصم کو ہم اس سے بھی نمٹ لیں گے ۔

عورت نے تھوک نگلتے ہوئے گھٹی گھٹی سی آواز میں کہا ۔

میرا کوئی ہوتا تو ضرور لے آتی ۔

سلیم گھوڑے سے اتر پڑا ۔

میری طرف دیکھو بہن ! مجھے بتاؤ کیا بات ہے ۔ میں تمہارا بھائی ہو
ان سے بات کروں گا ۔

عورت اپنے آنسو پونچھنے لگی ۔

بھائی !

سلیم آگے بڑھ آیا ۔

ہاں ۔ گھبراؤ نہیں ، بتاؤ کیا بات ہے ۔

عورت نے اپنے سر پہ دوپٹہ درست کیا اور کہنا شروع کیا ۔

میرا نام بلقیس ہے بھیا ! میرا اس دنیا میں سوائے اللہ کے کوئی
نہیں ۔ نہ ماں ، نہ باپ ، نہ بہن نہ بھائی ۔ ایک شوہر تھا وہ بھی میری بدقسمتی
تین سال ہوئے مر چکا ہے ۔

یہ زمین جس میں تم کھڑے ہو میری ہے ۔ یہ میں نے ان دونوں بھائی
کو آج سے دو سال قبل حصے پر جوتنے کو دی تھی ۔ اس دو سال کے عرصہ میں انہو
نے مجھے زمین کی آمدنی سے کچھ بھی نہیں دیا ۔ سب کچھ خود ہی کھا جاتے رہے ہیں
میں نے ان کی بہت منت سماجت کی مگر انہوں نے میری کوئی بات
سنی ۔ میں بھوکی مرتی رہی ۔ لوگوں کا کام کر کر کے گزارہ کرتی رہی مگر ان پر کچھ ا

ہوا ۔ اب میں نے انہیں کہا ہے کہ میری زمین چھوڑ دو میں کسی اور کو حصے پر
ی ہوں مگر یہ پھر بھی نہیں مانتے ۔ کئی دن سے منت کر رہی ہوں مگر انہوں
آج پھر زمین جوت لی ہے ۔ میں منع کرنے آئی تو میرے ساتھ جھگڑا شروع
ردیا اور الٹا مجھے مارنا شروع کر دیا ۔

وہ بچاری پھر رو پڑی

سلیم ان میں سے ایک کے قریب آیا ۔

تم کیوں اس کی زمین نہیں چھوڑتے اور تم نے اس بے کس پر ہاتھ
یوں اٹھایا ۔

اس نے مونچھیں پھڑپھڑاتے ہوئے کہا ۔

جاؤ جاؤ خسکا کھاؤ یہاں سے ۔ آیا بڑا ہمدرد بن کر ۔

سلیم اور قریب آ گیا ۔

سیدھی طرح بات کرو ۔

میں نے تمہارے جیسے بہت بدمعاش دیکھے ہیں ۔ ساری بدمعاش
ہری کر کے جیب میں ڈال دوں گا ۔

تم زمین نہیں چھوڑو گے ۔

نہیں چھوڑیں گے ۔

جھگڑا کرنا چاہتے ہو ۔

کر لو ۔ رک جو گئے ہو ۔

سلیم کا غصہ اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا ۔

تو پھر دونوں اس طرف آجاؤ میں تم دونوں کی ایک ساتھ گردن درست کرنا چاہتا ہوں۔

سامنے والا فوراً ایک طرف ہو گیا۔

دوسرے نے پنجالی سے لٹکتی ہوئی کلہاڑی اٹھالی اور زور سے گرجا۔ اسی زمین میں تمہاری قبر نہ بنادوں تو رونق نام نہیں۔

اسی لمحہ نواب نے دو ہوائی فائر کیے اور شیر کی طرح دھاڑا۔

کلہاڑی وہیں رکھ دو ورنہ یہیں بیٹھے بیٹھے دونوں کو چھلنی کر دوں گا۔

اس نے کلہاڑی وہیں رکھ دی۔

اب جاؤ اس کی طرف۔

سلیم درمیان میں اور وہ دونوں دائیں بائیں سے اس کی طرف بڑھے جونہی ان میں سے ایک نے مکّہ مارنے کے لیے ہاتھ لہرایا سلیم نے فوراً دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سامنے کھینچ لیا اور جو مکّہ مار رہا تھا اس کا مکّہ سلیم کے بجائے اس کے بھائی کو ہی لگ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے لگاتار دو مکّے اس کی ناک پر دے مارے اور وہ دُور جا گرا۔

سلیم نے اب اپنے سامنے دبوچے ہوئے کی طرف دھیان دیا اور اس کے کندھوں، گردن اور سر پر خوب ہتھوڑے برسائے۔

اسے چھوڑ کر سلیم پہلے کی طرف گیا اور دو چار ہاتھ مار اسے پھر دوہرا کر کے گرا دیا۔

باری باری وہ ان دونوں پر اس قدر سختی اور تیزی سے جھپٹا کہ وہ

ں کے سامنے زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکے اور نڈھال ہو کر ہاتھ پاؤں چھوڑ دیے۔

سلیم نے ان دونوں کو اُٹھا کر کھڑا کیا اور سختی سے حکم دیا۔

کان پکڑو۔

وہ دونوں کھڑے رہے۔

تم دونوں نے سُنا میں نے کیا کہا ہے۔

انہوں نے کان پکڑ لیے۔ ٹانگوں سے نیچے ہاتھ لے جا کر۔

سلیم ان دونوں کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

اب تین بار کہو ہم بہت ذلیل ہیں۔

وہ چُپ رہے۔

سلیم نے اپنا جُوتا اُتار کر ان کی پیٹھ پر دو دو لگائے۔

کہو جو میں نے بتایا ہے۔

ان دونوں نے تین تین بار کہا۔

ہم ذلیل ہیں، ہم ذلیل ہیں، ہم ذلیل ہیں۔

چلو کھڑے ہو جاؤ۔

دونوں کھڑے ہو گئے۔

اتنے میں نواب گھوڑے سے اُترتا ہُوا چلا آیا

ذرا ٹھہرنا سلیم! میں ان کا علاج کرتا ہوں۔

زمین کنارے کسی نے حقّے کی ٹوپی الٹی ہوئی تھی۔ نواب نے وہاں سے لا اٹھائی اور ان دونوں کے مُنہ پر ملنے کے بعد دھاڑا۔

دونوں آگے بڑھو اور اپنے بیلوں پر بیٹھ جاؤ۔

وہ بیلوں پر بیٹھ گئے۔

نواب نے پیچھے بیلوں کو ہانک دیا۔

اپنے گھر تک اسی طرح جانا۔ ورنہ یاد رکھو میں وہاں تک بھی پہنچ جاؤں گا۔

سلیم اب بلقیس کی طرف مخاطب ہوا۔

لو بہن! اب یہ تمہاری زمین میں ہل نہیں چلائیں گے۔

اس نے بڑی ممنونیت سے کہا۔

تمہاری مہربانی ہے میرے بھائی! تم نے میری عزت بھی بچائی ہے اور زمین بھی واپس دلا دی ہے۔ کون ہو تم لوگ۔

یہ نہ پوچھو کہ ہم کون ہیں۔ بس یہی جانو کہ ہم تمہارے بھائی ہیں۔

وہ تو ٹھیک ہے پر میرے بھائیوں کے نام کیا ہیں۔

میرا نام سلیم ہے اور اس کا نام نواب ہے۔

بلقیس اداس ہو گئی۔

وہ سلیم اور نواب جو قاتل اور مفرور ہیں۔ اور جنہیں پولیس تلاش کرتی پھر رہی ہے۔

ہاں بہن! وہی سلیم اور نواب۔

گلوگیر آواز میں اس نے پوچھا۔

پر تم لوگ قاتل کیسے بن گئے۔

گھٹی گھٹی سی آواز میں سلیم نے کہا۔

یہ ایک طویل کہانی ہے میری بہن! کبھی فرصت میں بیٹھ کر تمہیں بتا دوں گا۔ تاہم میں یہ بات ضرور کہوں گا کہ ہم قاتل نہیں۔ ہم قانون کے باغی نہیں ہیں۔ ہم پر اس قدر ظلم ہوئے اس قدر ظلم ہوئے کہ ہم یہ راہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔

بلقیس نے تاسف سے کہا۔

کیا زمانہ آ گیا ہے لوگ ایک دوسرے سے جینے کا حق چھینتے پھرتے ہیں ——— سلیم بات ٹال گیا۔

چھوڑو ان باتوں کو بہن میری ایک بات مانو۔

کیا؟

اپنی زمین تم حصے پر مت دو۔ تمہارا اپنا یہ دس بارہ سال کا بچہ ہے، کافی ہوشیار اور چالاک بھی ہے۔ یہ خود ہی ہل چلائے گا۔ اس طرح تمہاری آمدنی میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہو جائے گا۔

بلقیس پھر کملا سی گئی۔

بیل اور دوسری کھیتی باڑی کی چیزیں میں کہاں سے خریدوں گی۔ میرے پاس تو ایک بکری کی قیمت بھی نہیں ہے۔

اس کا تم فکر نہ کرو۔ رقم کا انتظام ہم کر لیں گے۔

تم کر لو گے۔

ہاں، شام کو میں رقم تمہیں پہنچا دوں گا۔

دونوں سوار اور آگے نکل گئے۔ بلقیس بچوں کے ہمراہ گھر کی طرف

چل دی۔

رات عشاء سے ذرا پہلے ہی جب کہ سب لوگ جاگ رہے تھے۔ سلیم اور نواب بلقیس کے گھر داخل ہوئے۔ بیرونی دروازے کے باہر ہی وہ رک گئے۔ اندر صحن سے چھوٹے بچے کے رونے کی آواز دے رہی تھی۔ وہ بار بار پکار رہا تھا۔

امی! امی! امی لاؤ۔

اچانک بڑے بچے کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

منے چپ ہو جاؤ ورنہ میں بھی رو پڑوں گا۔

چھوٹا بچہ جب چپ نہ ہوا تو بڑا بھی رونے لگ گیا۔ عجیب آہ و زاری سے رو رہے تھے بچارے۔ ارد گرد کے مکانوں والے لوگ جاگ رہے تھے مگر کوئی بھی انہیں پوچھنے نہ آ رہا تھا۔

سلیم دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ نواب بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ دونوں چارپائیاں صحن میں بچھی ہوئی تھیں اور ان دونوں کے درمیان دونوں بچے زمین پر بیٹھے رو رہے تھے۔

سلیم کو دیکھتے ہی بڑا بچہ اٹھ کر بھاگا اور اس کے پاؤں پکڑ لیے۔

ماموں! خدا کے لیے میری امی کو بچاؤ۔ اس کی عزت لٹ گئی تو ہم مر جائیں گے۔

سلیم نے بڑے پیار سے اسے اوپر اٹھایا۔

کیا ہوا بیٹے! کہاں ہے تمہاری امی۔

اس نے سسکتے ہوئے کہا۔

ماموں! وہ دن کے وقت جن دو بدمعاشوں سے تم نے میری امی کو بچایا تھا وہ ابھی ابھی اسے اٹھا کر لے گئے ہیں۔ گاؤں کے کسی آدمی نے ہماری مدد نہیں کی۔ دیکھو تو ماموں! سب ہی لوگ اپنے اپنے مکانوں کی چھتوں پر بیٹھے ہیں۔ پر کسی نے انہیں منع نہیں کیا۔ میں نے ان معاشوں کو روکا تو انہوں نے مجھے بھی مارا اور امی کو اٹھا کر لے گئے۔

اس نے سلیم کا ہاتھ پکڑ کر اپنے منہ کی طرف اشارہ کیا۔

یہ دیکھو ماموں! وہ مار کر میرا ایک دانت بھی نکال گئے ہیں۔

سلیم نے دیکھا اس کے منہ سے خون بھی بہہ رہا تھا اور اس کا سامنے والا ایک دانت نہیں تھا۔ سلیم خلاؤں میں کھو گیا۔

بچہ پھر بولا۔

آج میں اگر جوان ہوتا تو خدا کی قسم وہ میری امی کو اٹھانے کی کبھی جرأت نہ کر پاتے۔ میں ایک ایک کے ستر زخم لگاتا۔

سلیم خاموش تھا اور ابھی تک خلاؤں میں گھور رہا تھا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بھی بہہ رہے تھے۔ نواب کی پلکیں بھی تر تھیں۔ بچے نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ہلایا۔

ماموں! کیا تم ہماری مدد نہ کرو گے۔

سلیم چونک گیا۔

ضرور ——— میں تمہاری مدد کروں گا بیٹے! میں تمہاری امی

کو واپس لاؤں گا ۔ میں ان کتّے کے پلّوں کو بتاؤں گا کہ ایک بیوہ اور بے بس عورت پر کیسے ظلم ڈھایا جاتا ہے ۔ تم مجھے صرف یہ بتاؤ کہ ان کا گھر کس طرف ہے ۔

بچّے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ۔

چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں ۔

نواب اپنی آنکھیں خشک کرتے ہوئے سامنے آ گیا ۔

تم یہیں رہو بیٹے اور اپنے چھوٹے بھائی کو سنبھالو ۔ مجھے ان کے گھر کا پتہ ہے ۔ آج تم نے ہمیں ماموں کہا ہے ۔ ہم آج دکھائیں گے کہ بھائی اپنی بہن کی بے عزتی کا انتقام کیسے لیتے ہیں ۔ تمہارا نام کیا ہے بیٹے !

بچّے نے منہ سے بہتا ہوا خون صاف کیا ۔

میرا نام نادر اور چھوٹے بھائی کا نام مراد ہے ۔

دو تین گلیوں میں سے گزرنے کے بعد سلیم اور نواب ایک بڑی سی حویلی کے دروازے پہ آ کر کھڑے ہوئے ۔ گھوڑے پر بیٹھے ہی بیٹھے سلیم نے دیکھا برآمدے کے ایک ستون کے ساتھ بلقیس رسّیوں سے جکڑی ہوئی تھی اور صحن میں ان دو بھائیوں کے علاوہ چار اور مرد بھی بیٹھے تھے ۔ ان چاروں کے پاس رائفلیں تھیں ۔ شاید بدمعاش تھے اور باہر سے منگوائے گئے تھے ۔

سلیم گھوڑے سے اتر گیا اور نواب سے سرگوشی کی ۔

اندر چھ آدمی بیٹھے ہوئے ہیں ۔ چار کے پاس رائفلیں بھی ہیں ۔ میں

دیوار پھلانگ کر اندر جاتا ہوں اور صحن میں دائیں طرف سیمنٹ کی ایک لمبی ناند ہے اس میں جا کر بیٹھ جاؤں گا ۔ اتنے میں تم دروازے پر دستک دینا ۔ لازمی بات ہے وہ پوچھیں گے کہ کون ہے اور جب تم اپنا آپ بتاؤ گے تو وہ تم سے نمٹنے کے لیے دروازے کی طرف لپکیں گے ایسے میں ان پر ہوائی فائر کر کے میں انہیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دوں گا ۔ اس کے بعد تم بھی اندر آ جانا اور پھر دونوں مل کر انہیں اس طرح پیسیں گے جیسے چکی کے دو پاٹوں کے درمیان مکئی پستی ہے ۔

سلیم بڑی رازداری اور پُراسرار طریقے سے دیوار پھلانگ کر اندر گیا اور ناند میں جا کر چھپ کے بیٹھ گیا ۔ اپنا ریوالور اور خنجر اس نے ناند کے اندر رکھ دیئے اور رائفل کا رخ صحن کی طرف کر کے وہ مستعد ہو کر بیٹھ گیا ۔

نواب نے زور سے دروازے پر رائفل کا بٹ مارا ۔

دروازہ کھولو بدمعاشو !

اندر سے کسی نے پوچھا ۔

کون ہے ؟

نواب کی گرجدار آواز سنائی دی ۔

میں نواب ہوں ۔

دو جوان ایک ساتھ بول پڑے ۔

لو وہ آ ہی گئے ۔ تیار ہو جاؤ ۔

ایک اور آواز ابھری ۔

آج بچ کر جانے نہ پائیں ۔

سلیم سب کچھ سن رہا تھا ۔

ایک اور مدھم آواز ابھری

صرف ایک آدمی دروازہ کھولو اور باقی دونوں دروازوں کے پیچھے چھپ کر کھڑے ہو جاؤ ۔ جونہی اندر داخل ہوتے ہیں مار مار کر حلیہ بگاڑ دو سالوں کا ۔

وہ سارے کھڑے ہو گئے اور صحن میں چلتے ہوئے جب دروازے کے پاس آئے تو دفعتہً ہی سلیم نے دو ہوائی فائر کیے اور ساتھ ہی پوری قوت سے چلایا ۔

یہیں کھڑے رہو بدمعاشو ! اور ہتھیار ڈال دو ۔ کسی نے بھی اگر ہلنے کی کوشش کی تو یہ بات ذہن میں رکھنا کہ چھلنی ہو جائے گا ۔

وہ سب اپنے قدموں پر جم کر رہ گئے ۔ ان میں سے ایک ادھر ادھر جھانکتے ہوئے بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا ۔ سلیم نے تاک کر دو گولیاں اس کے پاؤں کے قریب ماریں اور پھر چلا کر کہا ۔

بھاگنے کی کوشش بیکار ہے ۔ سیدھی طرح کھڑے رہو ۔ ادھر ادھر مت جھانکو ۔

سب نے اپنے ہتھیار پھینک دیئے ۔ اور ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو گئے ۔ اتنے میں نواب نے لگاتار رائفل کے دو بٹ دروازے

پر مارے اور اسے توڑ کر اندر آ گیا ۔ سب سے پہلے اس نے ایک ایک کی تلاشی لی ۔ پھر سارے ہتھیار اٹھا کر وہ ناند کے پاس رکھ آیا ۔ پھر وہ ستون کی طرف گیا اور بلقیس کی رسیاں کاٹ دیں ۔

دوبارہ وہ ناند کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا اور اپنی رائفل کا رخ ان سب کی طرف کر لیا تھا ۔ اب سلیم ناند سے نکلا ۔ رائفل اور ریوالور اس نے وہیں رکھ دیئے اور ٹوکا ہاتھ میں لیے ہوا تھا ۔ ان کے قریب آ کر اس نے ٹوکا ہوا میں لہرایا ۔

سب ایک لائن میں کھڑے ہو جاؤ ۔

انہوں نے فوراً ایک لائن بنالی ۔

سلیم نے بلقیس سے پوچھا ۔

کون کون تمہیں اٹھانے گیا تھا بہن !

روہانسی سی آواز میں اس نے جواب دیا ۔

یہ سب گئے تھے

سلیم نے پھر ٹوکا لہرایا اور زہریلی آواز میں کہا ۔

چاہیے تو یہ تھا کہ تم سب کی گردنیں اڑا دی جاتیں ۔ مگر میں تم پر ترس کھاتا ہوں ۔ صرف سب کا ایک ایک ہاتھ اور وہ بھی بایاں ہاتھ کاٹوں گا ۔ تاکہ تمہیں بھی نصیحت ہو اور دوسرے بھی عبرت پکڑیں ۔ سب اپنا اپنا بایاں ہاتھ آگے کر لو ۔

سلیم جونہی سب سے پہلے آدمی کے قریب گیا ۔ اس نے

جھپٹ کر اس کا لٹھ پکڑ لیا اور سلیم کو اپنے سامنے کھینچ لیا۔ دو اور ساتھی بھی آگے آئے اور سلیم کو دبوچ لیا۔

اب وہ سب سلیم کی آڑ میں تھے۔

ان میں سے ایک زوردار آواز میں بولا

نواب رائفل پھینک دو ورنہ ہم سلیم کا گلہ کاٹ دیں گے۔

سلیم نے ابھی تک لٹھ کے پر اپنی گرفت مضبوط رکھی ہوئی تھی۔

بائیں ہاتھ کی کہنی اور دائیں گھٹنے کو اس نے خوب زور سے دائیں بائیں مارا اور جو دو آدمی اسے دبوچے ہوئے تھے۔ وہ دور جا گرے۔

اب ایک آدمی رہ گیا تھا جس نے سلیم کا لٹھ کا پکڑا ہوا تھا سلیم اس کے ساتھ قوت آزمائی کرنے لگا اور ایک سخت جھٹکے کے ساتھ اس نے اپنا لٹھ کا چھین لیا۔ مگر وہ پھر سلیم پر جھپٹا۔

اسی لمحہ نواب نے تاک کر گولی چلائی اور سلیم پر جھپٹنے والے کا سر تربوز کی طرح پھٹ گیا۔

نواب نے خوفناک قہقہہ رات کی تاریکی میں بلند کیا۔

بچے! میرا نشانہ بہت کم خطا جاتا ہے۔ تم ذرا پیچھے ہٹ جاؤ سلیم!۔

سلیم جونہی پیچھے ہٹا، نواب کی طرف سے لگاتار کئی گولیاں آئیں اور ان سب کو خون میں نہلا گئیں۔

ان کے مرتے ہی گاؤں کے کافی لوگ وہاں جمع ہو گئے تھے۔

سلیم نے ان میں سے ایک جوان کو چوکیدار اور نمبردار کو بلانے کے لیے کہا۔ وہ دونوں بھی شاید ان لوگوں میں آئے تھے کیونکہ وہ جوان تھوڑی ہی دیر میں ان دونوں کے سلیم کے سامنے لاتا ہوا بولا۔

یہ ہے چوکیدار اور یہ نمبردار ہے۔

سلیم نے چوکیدار سے کہا۔

تمہارا کیا کام ہے۔

اس نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

جی چوکیداری کرنا۔

تم کیسے چوکیدار ہو کہ تمہارے سامنے ایک عورت کو غنڈوں نے اس کے گھر سے اٹھا لیا اور تم نے کچھ بھی نہ کیا۔

جی میں کیا کر سکتا تھا۔ وہ چھ تھے اور ان کے پاس رائفلیں تھیں۔

ہم دونوں نے بھی تو ان پر قابو پا ہی لیا ہے نا۔

تمہاری بات اور ہے۔ لوگ تم دونوں سے خوف کھاتے ہیں۔

کوئی اور بات نہیں ہے۔ ہماری طرح کے اس گاؤں میں سینکڑوں جوان ہیں۔ اگر تم لوگ سب مل کر کوشش کرتے تو ان کی جرأت نہ تھی کہ وہ ایک بیوہ پر ہاتھ اٹھاتے۔ تم لوگ بے شک ان کے سامنے نہ آتے چھت پر ہی کھڑے ہو کر اگر تم لوگ ان پر پتھروں کی بارش کر دیتے تو یقیناً انہیں سر چھپانے کی جگہ نہ ملتی۔ انسان وہی ہے جو دوسروں کے کام آئے۔

کیا یہ بے عزتی اور بے غیرتی کی بات نہیں کہ سینکڑوں جوان مردوں کی

موجودگی میں ایک مجبور عورت پر ظلم ہُوا۔

اسی لیے تو ہمارے ملک میں آئے دِن چوریاں ہو رہی ہیں۔ بے جا ظلم ہو رہے ہیں۔ بے گناہ قتل ہو رہے ہیں۔ غریبوں پر ستم ڈھائے جا رہے ہیں۔ انتظامیہ ہر جگہ تو موجود نہیں ہوتی نا۔ یہ صِرف حکومت کا ہی کام نہیں کہ مظلوموں کی حفاظت کرے اور بے گناہوں کو ظالموں کے استبداد سے بچائے رکھے۔

یہ ہم لوگوں کا بھی کام ہے کہ ہم لوگ متحد ہوں۔

ایک آواز ہوں۔

ہم خیال ہوں۔

یک جان ہو کر ظالموں اور گناہ گاروں کے مقابلے میں چٹان بن کر کھڑے ہو جائیں تو کسی کی جراُت نہیں ہو سکتی کہ معاشرے میں غلط کام کرے اور پھر اس طریقے سے انتظامیہ کا کام بھی سہل ہو جاتا ہے اور وہ لوگوں کی حمایت اور اتحاد کے ساتھ اپنے کام کو پہلے سے کئی گُنا بہتر انداز میں کر سکتی ہے۔

اور نمبردار جی آپ! آپ تو انتظامیہ کے ایک رکن ہیں۔ آپ لوگوں کو تو ایسے موقع پر مثالی کردار ادا کرنا چاہیئے۔ اب دیکھئے نا آپ اس گاؤں کے نمبردار ہیں۔ لوگ آپ سے بہت سی اُمیدیں وابستہ رکھتے ہیں۔

نمبردار نے دُکھ بھری سی آواز میں کہا۔

کہنا تمہارا تو ٹھیک ہے۔ پر کیا کریں۔ ہم لوگ بے بس ہوتے ہیں

کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ مثال کے طور پہ اس علاقے میں روز چوریاں ہو رہی ہیں۔ خود ہمارے گاؤں میں دو بار چوری ہو چکی ہے مگر کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بیس بیس پچیس پچیس گھوڑ سوار رائفلوں سے لیس ہو کر آتے ہیں اور سینکڑوں مال مویشی ہانک کر لے جاتے ہیں۔ اب ایسے موقع پر ایک نمبردار کیا کر سکتا ہے۔

قریب ہی کھڑے ایک بوڑھے آدمی نے کہا۔

کیا کریں جی کُتی چوروں کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔

سلیم نے پریشانی سے پوچھا۔

کیا مطلب؟

مطلب یہی کہ علاقے کی انتظامیہ چوروں کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔

یہ جھوٹ ہے اور اگر سچ بھی ہو تو آپ لوگ متحد ہو کر ان کے گٹھ جوڑ کو بڑی آسانی کے ساتھ ناکام بنا سکتے ہیں۔

وہ کیسے؟ طریقہ تم بتا جاؤ عمل اس پر ہم کر لیں گے۔

تو پھر تم لوگ ایسا کرو کہ گاؤں میں داخل ہونے کے جو جو راستے ہیں وہاں کے قریبی مکانوں کی چھتوں پر اینٹوں کے مورچے بنا لو اور ان میں چھوٹے چھوٹے پتھروں کے ڈھیر لگا دو اور ہر مورچے میں کم از کم دس آدمی بٹھا دو۔

اس طرح گاؤں میں چوکیدار کے گھومنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی مورچوں والے لوگ چوکس رہیں۔ اور جب وہ رائفلوں والے لٹیرے گاؤں

میں داخل ہوں تو چاروں جانب سے ان پر پتھروں کی بارش کر دی جائے اس طرح تم لوگ ایک ماہ کر کے دکھاؤ۔ میں کہتا ہوں وہ ڈاکو کسی گاؤں میں داخل ہونے کی جرأت نہ کریں گے۔ ویسے ہم دونوں بھی اپنے طور پر کھوج لگانے کی کوشش کریں گے کہ کون یہ مذموم حرکتیں کر رہا ہے۔

نمبردار نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

کہتے تو تم ٹھیک ہی ہو۔

تو پھر اس پر عمل کر کے دکھاؤ۔

آؤ نواب چلیں۔ آؤ بہن تم بھی۔

اس نے بلقیس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

دونوں بلقیس کے گھر داخل ہوئے۔ وہ خود بھی ان کے ساتھ تھی اس نے بھاگ کر چھوٹے بچے کو اٹھا لیا اور اسے پیار کرنے لگی۔ بڑے بچے کو بھی اس نے اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔

سلیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

لو نادر! ہم اپنے وعدے کے مطابق تمہاری امی کو لے کر آئے ہیں نا۔

ماں کو چھوڑ کر نادر سلیم کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

بہت اچھے ہو ماموں!

سلیم نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور نوٹوں کی ایک گٹھی نکالی اور بلقیس کو تھما دی۔

یہ لو بہن! یہ اڑھائی ہزار روپیہ ہے۔ اس میں سے دو بیلوں کا بندوبست کر لو۔ ہل اور پنجالی ہم خود تمہیں پہنچا دیں گے۔

بلقیس رو پڑی۔

کس منہ سے تم دونوں بھائیوں کا شکریہ ادا کروں۔

نواب نے جواب دیا۔

شکریہ کا ہے کا بہن! ہم تمہارے بھائی ہیں اور یہ ہمارا فرض ہے۔ اچھا ہم اب چلتے ہیں۔

نہیں ایسے کیسے ہو سکتا ہے۔ کھانا کھا کر جائیں۔

بلقیس تڑپ اٹھی۔

سلیم نے اسے سمجھایا۔

تم جانتی ہو بہن! کہ ہم مفرور ہیں۔ کسی نے ہماری موجودگی کی پولیس کو اطلاع کر دی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

بلقیس بیچاری خاموش ہو گئی۔

سلیم اور نواب باہر نکل گئے۔ بلقیس دونوں بچوں کے ساتھ دروازے پر کھڑی ہو کر ان کو دیکھتی رہی۔ جب وہ اندھیرے میں روپوش ہو گئے تو اس نے دروازے کو زنجیر لگائی اور دونوں بچوں کے ہاتھ پکڑے اندر چلی گئی۔



(۱۹)

گاؤں سے باہر کشور گوبر تھاپ رہی تھی کہ اس نے دیکھا کہ سلیم اور نواب ایک طرف سے کچی پگ ڈنڈی پر اپنے گھوڑے سرپٹ دوڑاتے آرہے ہیں ۔ گاؤں سے قریب آکر دونوں علیحدہ ہو گئے ۔

نواب گاؤں سے باہر ہی درختوں کے ایک جھنڈ میں جاکر کھڑا ہو گیا اور سلیم سیدھا گاؤں جا داخل ہوا ۔

کشور نے قریب ہی پانی کی ایک کھڈ میں جلدی جلدی ہاتھ دھوئے اور گھر کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی ۔ پوری رفتار سے وہ بھاگ رہی تھی ۔

بالکل متوحش ہرنی کی مانند ۔

سلیم جو آیا تھا ۔

اس کی منزل، اس کا ساتھی ۔

اس کا ساحل اس کا کنارہ ۔

اس کی آرزو اس کی اُمید ۔

بھاگتی ہوئی جب وہ گھر داخل ہوئی تو سلیم کا گھوڑا صحن میں کھڑا تھا اور وہ اندر کمرے میں ماں سے باتیں کر رہا تھا ۔

کشور دروازے پر کھڑی ہو کر اسے دیکھنے لگی ۔ کشور کو دیکھتے ہی گلشن فوراً دوسرے کمرے میں چلی گئی ۔

گلشن کے چلے جانے کے بعد بھی کشور وہیں کھڑی رہی ۔ ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی اسے ۔ کتنا بدل گیا تھا ۔

چہرہ بھی پہلے سے دھندلا اور سخت ہو گیا تھا ۔

بالوں میں گرد اور کپڑے میلے تھے ۔

اچانک سلیم کے بازو پھیلائے اور وہ چونک گئی ۔ دوبارہ وہ بھاگی اور سلیم کے بازوؤں میں سما کر اس سے بُری طرح لپٹ گئی اور رونے لگی ۔

سلیم نے اسے علیحدہ کیا اور دُکھ سے پوچھا ۔

رو رہی ہو کشور !

کشور نے فوراً اپنے آنسو دوپٹے سے پونچھ لیے ۔

نہیں تو، صرف آپ کے آنے کی خوشی میں آنکھوں میں آنسو آگئے تھے ۔

کیسی ہو۔

دُور ——— بہت بہت دُور سے کشور کی ڈوبتی اور غوطے کھاتی سی آواز اُبھری۔

بس ٹھیک ہوں

سلیم اُداس ہو گیا۔

تمہیں افسوس تو ہوگا کہ کس قاتل سے شادی کر لی ہے۔

کشور نے اس کی چھاتی پر سر رکھ دیا۔

مجھے فخر ہے کہ آپ میرے شوہر ہیں۔

امی میرے بعد گھبراتی تو نہیں

جب تک میں زندہ ہوں انہیں غمگین نہ ہونے دوں گی آپ جب گھر تھے تو میں ان کی بہو تھی۔ اب جب کہ آپ گھر نہیں تو میں ان کا بیٹا بھی ہوں، ان کا سہارا اور لاٹھی بھی ہوں۔

سلیم نے اس کے سیاہ گھنے اور باریک بال چوم لیے۔

مجھے ہمیشہ تم پر ناز رہے گا۔ تمہیں افسوس تو نہیں کہ میں نے یہ راستہ اختیار کیا ہے

ہرگز نہیں۔ یہ راستہ ہمارے لیے ناگزیر ہو گیا تھا۔ آپ کے بعد منشی امین اور ماسٹر حنیف ہمارا بڑا خیال رکھا۔ ہر روز پوچھتے ہیں کہ کوئی کام ہو۔

وہ دونوں نیک اور راست باز انسان ہیں۔ ایسے لوگ کبھی کبھی

ہی ملتے ہیں۔

میں نے آپ کے لیے کپڑے بھی سی کر رکھے ہوئے ہیں۔

کتنے جوڑے؟

جتنے آپ مانگیں گے۔

دو کیوں دو یا چار۔ ایک اور تین نہ ہوں۔

کیوں؟

دو ہوئے تو ایک میرا اور ایک نواب کا چار ہوئے تو دو اس کے اور دو میرے اور اگر چھ ہوئے تو اور بھی اچھا ہے۔

چھ چھوڑ میں آٹھ دے دوں گی۔ آپ کو میں آپ کے کپڑے اسی طرح سی رہی ہوں جس طرح ہم اکٹھے رہتے تھے اور میں آپ کے لیے کپڑے سیتی رہتی تھی۔

میں تمہارا مشکور ہوں کشور!

واہ شکریہ کا ہے کا۔ میں آپ کی بیوی ہوں اور یہ میرا فرض ہے۔ اگر آپ کہیں تو ماں کو بُلا لوں۔

وہ دوسرے کمرے میں اکیلی کھڑی ہیں۔

ہاں بُلا لو۔

کشور نے آواز دی۔

ماں جی!

دوسرے کمرے سے گلشن کی آواز سنائی دی۔

جی بیٹی !

ادھر ہی آجائیں نا ہمارے پاس ۔

گلشن ان کے پاس آکھڑی ہوئی ۔

سلیم نے جیب سے کچھ نوٹ نکالے اور ماں کی طرف بڑھائے۔

یہ رکھ لو ماں !

تم رکھو بیٹا ! تمہارے کسی کام آئیں گے ۔ اب تو زمین بھی حصہ پر چھڑ گئی ہے ۔ میرے اور کشور کے لیے بہت کچھ ہے ۔ بھینسوں کے چارے کے لیے بھی محنت نہ کرنا پڑے گی ۔

سلیم نے حیرت سے پوچھا ۔

زمین چڑھ گئی حصے پر ۔

ہاں بیٹے ! منشی امین نے چڑھا دی ۔

چودھری حاکم نے کوئی اعتراض تو نہیں کیا ۔

اس بار تو نہیں بولا ۔

کشور باہر نکلنے لگی ۔

میں آپ کے لیے دودھ لے آؤں ۔

گلشن نے اعتراض کیا ۔

تم نواب کو بھی ساتھ لے آتے بیٹا !

وہ گاؤں سے باہر ہی کھڑا ہے ماں ! میں نے بہت کہا ۔ لیکن نہیں آیا ۔ کہہ رہا تھا میں گاؤں سے باہر کھڑا ہو کر تمہاری چوکیداری

کروں گا ۔

اچھا اس کے لیے جاتے ہوئے لے جانا ۔

کشور اس کے لیے ایک پیالے میں مکھن اور دوسرے میں دودھ لے آئی ۔ سلیم نے مکھن کھایا اور پھر دودھ پی لیا ۔ کشور جب برتن لے جانے لگی تو سلیم نے کہا ۔

نواب کے لیے اتنا ہی دودھ اور مکھن ڈھکن والے دو ڈبوں میں ڈال دو ۔ میرے گھوڑے کی زین سے ایک تھیلہ بندھا ہوا ہے ۔ اس میں ہی رکھ دینا ۔

کشور برتن دھونے کے لیے صحن میں آئی تھی کہ بیرونی دروازے پر کسی نے دستک دی ۔ برتن نلکے کے پاس رکھتے ہوئے کشور نے پوچھا ۔

باہر سے آواز آئی ۔

میں ہوں بیٹی حنیف ۔

کشور نے دروازہ کھولا ۔ ماسٹر حنیف تھے اور ان کے پیچھے منشی امین تھے ۔ دونوں اندر آئے اور باری باری سلیم سے گلے ملنے لگے ۔ حنیف نے بڑی ہمدردی سے پوچھا ۔

ہمارے لائق کوئی خدمت سلیم !

سلیم نے بڑے مشکورانہ سے انداز میں کہا ۔

میرے لیے آپ جیسے مخلص اور ہمدرد انسانوں کی دعائیں کافی ہیں ۔

ان دونوں میں سے ابھی کوئی جواب بھی دینے پایا تھا کہ باہر گلی

میں اندھا دھند فائرنگ ہونے لگی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ایک ہی وقت میں کئی رائفلوں سے فائر کیا جا رہا ہو۔

پھر فضاؤں میں ایک آواز گونجی۔

سلیم! باہر آجاؤ۔ ہم تمہیں صرف پانچ منٹ دیتے ہیں اس کے بعد ہم مکان کو آگ لگا دیں گے۔ یہاں سے اب بھاگنے اور بچ نکلنے کی کوشش بیکار ہو گی۔

سلیم پہچان گیا۔ آواز چودھری حاکم کی تھی۔

گلشن رو پڑی۔

اب کیا ہو گا بیٹے!

سلیم نے اپنی رائفل سنبھالی اور ریوالور بھی نکال لیا۔

تم گھبراؤ نا ماں! میں ان سے خوب نمٹوں گا۔

سلیم جب باہر نکلنے لگا تو کشور نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

خدا کے لیے باہر نہ جائیے۔ بے شمار لوگ گلی میں آ جمع ہوتے ہیں۔

سلیم نے اسے بھی پیچھے ہٹا دیا۔

تم اندر ہی رہو کشور! میں اگر چپ رہا تو وہ اندر گھس آئیں گے اس طرح میرے لیے بچ نکلنا دشوار ہو کر رہ جائے گا۔

سلیم باہر آیا اور برآمدے کے ستون کی آڑ لیتے ہوئے بڑی تیزی کے ساتھ گلی کی سمت گولیاں برسانے لگا۔

گلی میں چودھری اور اس کے آدمی دیواروں کی اوٹ میں بیٹھ

گئے تھے سلیم فوراً ستون کی اوٹ سے نکلا اور اپنی حویلی کی سیڑھیوں پر آکر لیٹ گیا۔

سیڑھیوں کے ساتھ ساتھ چھت تک پختہ دیوار جاتی تھی۔ لہذا وہاں وہ محفوظ تھا اور باہر والے لوگوں کو بآسانی دیکھ بھی سکتا تھا۔

لیٹے ہی لیٹے اس نے اپنی رائفل اور ریوالور میں گولیاں بھر لیں۔

اتنے میں چودھری کے ایک آدمی نے صحن کی دیوار کے اوپر سے جھانکا۔ سلیم نے تاک کر گولی ماری جو اس کے سر کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ باہر گلی میں چند ثانیوں تک ہولناک چیخیں بلند ہوتی رہیں پھر پُراسرار اور کاٹ کھانیوالی خاموشی طاری ہو گئی۔

ناگاہ سلیم کی نگاہ دائیں جانب اٹھی تو اس نے دیکھا کہ نواب اپنا گھوڑا سرپٹ دوڑاتا ہوا آ رہا ہے۔ جب وہ نزدیک آیا تو وہ اسے آواز دے کر دور ہی رہنے کی ہدایت کرنا چاہتا تھا کہ نواب وہیں ایک مکان کے سامنے رکا۔ گھوڑے سے اتر کر وہ دیوار پر چڑھا اور پھر اندر پھلانگ گیا۔

سلیم گلی میں چھپے ہوئے چودھری اور اس کے آدمیوں کے ردّ عمل کا جائزہ لے رہا تھا کہ نواب سامنے والے مکان کی چھت پر نمودار ہوا۔ وہ جھکتا ہوا مکان پر بنے ہوئے پردے کی آڑ میں منڈیر کی طرف آ رہا تھا۔ اس نے اپنا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔

منڈیر پر آکر نواب نے چھت کے جنگلے کے ایک سوراخ میں

سے رائفل کا منہ تھوڑا سا باہر نکالا اور پھر گلی میں اندھا دھند فائرنگ کر دی۔ نیچے اسے وہاں سے کوئی آدمی نظر تو نہ آرہا تھا۔ بہرحال وہ انہیں خوفزدہ کرنے کی غرض سے بڑی تیزی کے ساتھ گولیاں برسا رہا تھا۔ اندر سے سلیم بھی بڑی تیزی سے فائرنگ کرنے لگا تھا۔

تھوڑی دیر بعد نواب نے آہستہ آہستہ سر اونچا کیا اور پھر جنگلے کے اوپر سے گلی میں جھانکا۔ اس نے دیکھا چودھری کا کوئی آدمی وہاں نہ تھا اس نے ہاتھ کے اشارے سے سلیم کو باہر آنے کے لیے کہا اور خود وہ دوبارہ گلی میں ادھر ادھر گولیاں مارنے لگا۔

سلیم جلدی جلدی اپنا گھوڑا لے کر گلی میں آیا۔ اندر گلشن اور کشور خوف اور دہشت سے کانپ رہی تھیں۔ نواب نے اسے اپنے گھوڑے کی سمت جانے کو کہا۔ سلیم فوراً گھوڑے پر سوار ہوا اور اسے دوڑاتا ہوا نواب کے گھوڑے کے پاس آکھڑا ہوا اور ایک کونے کی آڑ بھی لے لی تاکہ اگر کوئی حملہ آور ہو تو اس سے نمٹا جا سکے۔

نواب بھی چھتیں پھلانگتا اس سمت آرہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ پیچھے بھی مڑ کر دیکھتا اور دو ایک گولیاں چلانے کے بعد پھر آگے بڑھنے لگتا۔ دیوار پر آنے کے بعد وہ اپنے گھوڑے پر پھلانگ گیا اور اسے ایک طرف بھگاتے ہوئے کہا۔

آؤ چلیں۔

دونوں اپنے گھوڑے پوری رفتار سے دوڑاتے ہوئے بھٹے پر آئے

وہی جوان جنہوں نے ان کے ساتھ برکت کی مہم میں حصہ لیا تھا ان کے گھوڑے پکڑ کر بستی کی طرف لے گئے۔ سلیم نے زین سے اپنا تھیلا اتار لیا تھا۔

ڈھکن اٹھا کر دونوں اپنے تہ خانے میں داخل ہوئے۔ نواب نے اپنی چادر بستر پر پھینکتے ہوئے غصے میں کہا۔

چودھری حاکم حد سے بڑھ گیا ہے۔ ہمیں اب سب سے پہلے اسی کا بندوبست کرنا پڑے گا۔ یہ ہمارے راستے کا کانٹا ہے اور نواب ہر کانٹا دامن میں الجھنے سے پہلے ہی پاؤں تلے مسل دیتا ہے۔

نواب چٹائی پر بیٹھ گیا۔ سلیم نے دونوں ڈبے نکال کر اس کے سامنے رکھ دیئے۔

یہ لو۔

نواب نے حیرت سے پوچھا۔

کیا ہے؟

خود ہی دیکھ لو۔

نواب نے ڈبے کھولے۔ بڑا برتن دودھ کا بھرا ہوا تھا اور گرم بھی تھا۔ چھوٹا برتن جو ٹفن کیریر کا اوپر والا ڈبہ تھا اس میں تازہ مکھن اور اس پر شکر بھی تھی۔

نواب خوش ہو گیا۔

آہا ہاہا! بڑی مدت بعد ایسا مکھن کھانا نصیب ہو رہا ہے۔

میرا تو جی بھر آیا ہے ۔ آؤ بیٹھو کھائیں ۔

سلیم ہنس دیا۔

یہ تمہارا حصّہ ہے ۔ میں اپنے حصّہ کا کھا آیا ہوں ۔

نواب نے عجیب سے انداز میں سلیم کی طرف دیکھا ۔

سچ ۔

ہاں ہاں ۔

تو پھر یہ لو۔

وہ بڑی تیزی سے مکھن کھانے لگا ۔ سلیم اُسے دیکھ دیکھ کر ہنس رہا تھا ۔

مکھن ختم کر کے نواب نے دُودھ کی طرف اشارہ کیا ۔

اور یہ دودھ ؟

یہ بھی تمہارا حصّہ ہے ۔

نواب نے دُعا کے انداز میں ہاتھ اُٹھائے ۔

واہ میرے مولا ! تو کیسا مہربان اور رحیم ہے ۔ جس شخص کو اس طرح دودھ اور مکھن ملے اسے اور کیا چاہیئے ۔

اس نے دودھ کا برتن منہ کو لگایا اور ایک ہی سانس میں پی گیا اور پھر چادر سے منہ پونچھتے ہوئے پوچھا۔

ناں جی اور بھابی کیسی ہیں ۔

دونوں ٹھیک ہیں ۔ امّی ناراض ہو رہی تھیں کہ نواب کو کیوں

ساتھ نہیں لائے ۔ تم نے بتایا ہوتا کہ باہر کھڑا رکھوالی کر رہا ہے ۔

میں نے بتایا تھا ۔

باہر ڈھکن پر کھٹکا ہوا ۔ نواب فوراً اٹھا اور باہر نکل گیا ۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر تہ خانے میں آیا ۔ اس کے ہاتھ میں کھانے کے برتن تھے ۔ دونوں چٹائی پر آمنے سامنے بیٹھ گئے اور کھانا کھانے لگے ۔



(۲۰)

نواب تہ خانے کی چٹائی پہ بیٹھا ہوا تھا۔ سلیم اس کے پاس سے اُٹھا اور کوئلہ اُٹھا کر دیوار پر لکھا ہوا برکت کا نام کاٹنے کے بعد اس نے نواب سے پوچھا۔

اب کس کے نام کو نشان لگاؤں۔

نواب بھی کھڑا ہو گیا اور دیوار کی طرف اشارہ کیا۔

چودھری حاکم کو نشان لگاؤ۔ کل ہم اس کے ساتھ اپنا حساب صاف کریں گے۔ اس کے بعد پھر دوسروں کا بھی پلّہ پاک کریں گے۔

سلیم نے کوئلے سے چودھری حاکم کے نام کو ٹِک کر دیا۔

نواب پھر بیٹھ گیا۔

اب اس سے نمٹنے کا طریقہ بھی سوچنا ہوگا۔

سلیم پھر اس کے پاس آ بیٹھا۔

وہ تو میں نے پہلے ہی سوچ رکھا ہے۔

مجھے بھی تو بتاؤ نا۔

بستی کے وہی دو جوان۔ رشید اور اعظم بھی اس بار ہمارے ساتھ ہوں گے۔ چودھری حاکم ہر روز اپنے کنویں پہ آتا ہے۔ وہاں ان کا ایک مکان بھی ہے اور یہ ان کی عیاشی کا اڈہ ہے۔ یہاں وہ شراب پیتے ہیں اور معصوم لڑکیوں کی عزت سے کھیلتے ہیں۔ آج ہم اسی اڈے سے اس کو پکڑیں گے۔

کیا وہ اکیلا ہوتا ہے۔

نہیں اس کے ساتھ اس کے پانچ سات محافظ بھی ہوتے ہیں۔

ظاہر ہے ان کے پاس ہتھیار بھی ہوتے ہوں گے۔

ضرور ہوتے ہیں۔

پھر اس کنویں پر جانا آسان نہ ہوگا۔

اس کا بندوبست میں نے کر لیا ہے۔ رشید اور اعظم اپنے اسی دان والے دو گھوڑے لے لیں گے اور دونوں پر دو بڑے بڑے پٹھوں کے بورے ڈال لیں گے۔ ایک گھوڑے کے بورے میں ایک طرف میں اور ایک طرف تم بیٹھ جاؤ گے اور ہم دونوں کے اوپر وہ نئے برتن

رکھ لیں گے۔ دوسرے گھوڑے کے بورے میں سب کے سب نئے برتن ہی ہوں گے۔

دونوں اپنے آپ کو برتن بیچنے والے کمہار ظاہر کریں گے۔ اس طرح وہ گھوڑوں کو پانی پلانے کے بہانے کنوئیں پر چلے جائیں گے اگر تو وہاں حالات ہماری مرضی کے مطابق ہوئے تو ہم وہاں ان سے اُلجھ جائیں گے ورنہ واپس آ جائیں گے اور پھر کسی دن جا پکڑیں گے۔

نواب خوش ہو گیا۔

بہترین طریقہ ہے اس بین الاقوامی بدمعاش کو ختم کرنے کا۔

تو پھر کل ہی شروع کریں اس مہم کو۔

بالکل کل ہی شروع ہو گی۔

تو چلو پھر بستی چلیں۔ رشید اور اعظم سے بھی بات کرنا ہو گی تاکہ وہ بھی اپنے انتظامات مکمل کر سکیں۔

دونوں تہ خانے سے باہر آئے اور بستی کی طرف جانے لگے۔

دوسرے روز جب کہ سورج خاصا چڑھ آیا تھا۔ رشید اور اعظم دونوں گھوڑوں کو ہانکتے ہوئے چودھری حاکم کے کنوئیں پر جا پہنچے۔ دونوں گھوڑوں کے بوروں میں خوب برتن بھرے ہوئے تھے۔

سلیم نے بورے کے سوراخ میں سے دیکھا کہ کنوئیں کے ساتھ ہی شیشم کے ایک خوب پھیلے ہوئے درخت کے نیچے چار پلنگ بچھے ہوئے ہیں اور ان پر چودھری حاکم، اس کے دونوں بیٹے اور کچھ محافظ بھی بیٹھے

ہیں۔ درمیان میں دو حقّے بھی چل رہے تھے۔ ذرا دائیں جانب مکان کی دیوار کے ساتھ آٹھ یا دس رائفلیں بھی کھڑی کی ہوئی تھیں۔

گھوڑے پانی پینے لگ گئے۔ اتنے میں ایک بدمعاش چودھری حاکم کے پاس سے اٹھا اور ذرا قریب آ کر رشید پر برس پڑا۔

کون ہو تم لوگ اور کیسے یہاں آنے کی جرأت کی۔ تمہیں پتہ نہیں کہ یہاں کوئی نہیں آ سکتا۔

رشید نے منت کے انداز میں کہا۔

جی ہم تو کمہار ہیں۔ گاؤں گاؤں اور بستی بستی برتن بیچتے پھرتے ہیں۔ ہمیں معلوم نہ تھا کہ ادھر آنا منع ہے۔ گھوڑوں کو پیاس لگی تھی۔ ہم انہیں پانی پلانے یہاں چلے آئے ہیں۔ اگر تم لوگ ناراض ہوتے ہو تو ہم چلے جاتے ہیں۔

دفع ہو جاؤ پھر یہاں سے۔

رشید اور اعظم دونوں نے اپنے اپنے گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور انہیں کھینچتے ہوئے وہ پیچھے ہٹے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا کہ اب کیا کریں۔ اتنے میں بورے کے اندر سے سلیم نے رشید کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

اس شیشم کے درخت کے پاس سے گزرو اور چارپائیوں کے قریب کھڑے ہو کر ان سے چاندی کوٹ کی طرف جانے کا راستہ پوچھو۔

وہ دونوں شیشم کے پاس سے گزرے اور چارپائیوں کے قریب

کھڑے ہو کر رشید نے پھر اس جوان سے پوچھا۔

ہم نے چاندی کوٹ جانا ہے بھائی! کون سا راستہ جائے گا۔

اس نے روکھا سا جواب دیا۔

بائیں ہاتھ کو سیدھے آگے نکل جاؤ۔

رشید کھڑا ہو کر پھر سوچنے لگ گیا۔ کیونکہ اسے سلیم کی طرف سے ابھی اگلی ہدایت نہیں ملی تھی۔

اس بدمعاش نے پھر کھا جانے والے انداز میں رشید سے کہا۔

اب گم ہوتے ہو کہ نہیں۔

رشید جس گھوڑے کی باگ پکڑے ہوئے تھا اس کے بورے سے اچانک سارے برتن زمین پر گر گئے۔ سلیم اور نواب ایک ساتھ چھلانگ لگا کر زمین پر کود گئے۔

دونوں نے اپنی رائفلوں کا رُخ ان کی طرف کر رکھا تھا۔ رشید اور اعظم نے بھی پلک جھپکنے میں بورے کے اندر سے اپنی رائفلیں کھینچ لیں۔

سلیم نے دو ہوائی فائر کیے اور چودھری حاکم کو مخاطب کیا۔

چودھری! اپنے ساتھیوں کو لے کر پورے دس قدم اس طرف ہو جاؤ۔

چودھری وہیں کھڑا رہا اور اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ چکرا گیا تھا۔ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ سلیم اس قدر اچانک آ نمودار ہو گا۔

اسی وقت نواب نے نشانہ لیا اور دو فائر کر دیئے۔ دونوں گولیاں چودھری حاکم کے دونوں پاؤں کے درمیان زمین پر پیوست ہو گئیں۔ اس

کے ساتھ ہی نواب کی گرج سُنائی دی۔

تم نے سُنا نہیں کتے! کیا کہا میرے ساتھی نے۔

چودھری حاکم خوف اور دہشت سے پیلا ہو گیا اور اپنے سب ساتھیوں کے ساتھ دس قدم دائیں طرف جا کر کھڑا ہو گیا۔

رشید اور اعظم نے رائفلیں رکھ دیں اور ریوالور ہاتھ میں لیے وہ دونوں ان کی تلاشی لینے لگے۔ اچھی طرح اطمینان کر لینے کے بعد رشید نے زور سے کہا۔

سب ٹھیک ہے۔

واپس آ جاؤ۔ سلیم نے کہا۔

رشید اور اعظم واپس آ گئے اور پھر اپنی رائفلیں تان لیں۔ سلیم نے اپنی رائفل بورے میں رکھ دی اور ریوالور لے کر وہ چودھری حاکم کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

سناؤ چودھری! وقت نے میری اور تمہاری ملاقات کرائی ہے نا۔

چودھری چُپ رہا۔

سلیم نے ریوالور کا بٹ اس کی گردن پر مارا۔

بولو جواب دو۔

چودھری نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اگر تمہاری جان بخش دی جائے تو بتاؤ کتنی رقم دے سکتے ہو۔

چودھری کو اندھیرے میں اُمید کی کرن دِکھائی دی۔

جتنی رقم تم مانگو میں دوں گا۔

کتنی نقدی ہو گی تمہارے گھر میں۔

پچاس ہزار روپیہ تو ہو گا۔

تو پھر منگا لو یہاں۔

میں خود جاتا ہوں اور جا کر لے آتا ہوں۔

نہیں تم نہیں جا سکتے۔ اپنے کسی بیٹے کو بھیجو وہ جا کر لے آئے گا۔

چودھری نے اپنے بیٹے اختر کی طرف اشارہ کیا اور وہ گاؤں کی طرف چل دیا۔

سلیم نے اسے روکا۔

ٹھہرو! میرا ایک آدمی بھی تمہارے ساتھ جائے گا۔ تم نے اگر کوئی شرارت کی یا کسی کو اطلاع دینے کی کوشش کی تو یہ بات ذہن میں رکھنا کہ میں تمہارے ان سب آدمیوں کو چھلنی کر دوں گا۔ اور آتی دفعہ منشی امین کو بھی ساتھ لے کر آنا۔

اختر اور رشید گاؤں کی طرف چلے گئے۔ چودھری اور اس کے آدمی اسی طرح کھڑے تھے۔

سلیم دوبارہ نواب کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد رشید اور اختر لوٹ آئے۔ ان کے ساتھ منشی امین بھی تھے۔

رشید نے روپوں کی گٹھڑی لا کر سلیم کو تھما دی۔

پچاس ہزار روپیہ۔

سلیم نے رومال میں بندھے ہوئے نوٹ اٹھائے اور منشی امین کو تھما دیئے۔

منشی جی! یہ رقم اس چودھری نے غریبوں کا خون چوس چوس کر جمع کی ہے۔ اسے آج ہی مستحق لوگوں میں تقسیم کر دینا۔

منشی امین نے رقم لے لی اور ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

سلیم پھر ان سے مخاطب ہوا۔

چودھری حاکم تم یہاں منشی امین کے پاس آ کر کھڑے ہو جاؤ۔

وہ تو پہلے ہی یہ چاہتا تھا۔ فوراً اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا سلیم نے نواب کی طرف اشارہ کیا۔ جواب میں نواب نے نگاہوں ہی نگاہوں میں رشید اور اعظم سے کچھ کہا اور پھر وہ چاروں اپنی رائفلیں تان کر کھڑے ہو گئے۔ اور ایک ساتھ فائرنگ شروع کر دی۔ چودھری حاکم کے دونوں بیٹے اور سب محافظ زمین پر تڑپ تڑپ کر ٹھنڈے ہو گئے۔

چودھری پر موت کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ مرنے والوں کی چیخ و پکار جب ختم ہوئی تو سلیم کی آواز پھر سنائی دی۔

منشی جی! آپ گھر چلے جائیں۔

رشید! تم دونوں اٹھا لو چودھری کو۔

حاکم نے اعتراض کیا۔

تم نے وعدہ کیا تھا۔ کہ رقم لے کر مجھے چھوڑ دو گے۔

سلیم نے ایک خوفناک قہقہہ لگایا۔
ہا ہا ہا ہا ——
تمہیں چھوڑ دوں گا۔
ایک باؤلے کتے کو چھوڑ دوں گا۔
فصلیں خراب کرنے والے ایک جنگلی سور کو چھوڑ دوں گا۔
غریبوں کا خون پینے کے عادی بھیڑیئے کو چھوڑ دوں گا۔
نہیں نہیں ——
تمہیں میں ایک مثالی موت ماروں گا۔ جو رقم تم نے دی ہے وہ تو غریبوں کا حق تھا۔ سو وہ تم سے وصول کر لیا گیا ہے۔
اس کے ساتھ ہی وہ گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ نواب نے حاکم کو اُٹھا کر بورے میں ڈالا اور سلیم کے پیچھے بیٹھ گیا۔ رشید اور اعظم دوسرے گھوڑے پر ہو بیٹھے۔ سارے برتن انہوں نے وہیں پھینک دیئے تھے۔
گھوڑے سرپٹ دوڑاتے ہوئے وہ دریا کنارے والے جنگل میں آئے۔ سلیم نے حاکم کو بورے سے نکالا۔ وہ کانپتے کانپتے ایک درخت کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔
سلیم نے بورے کے اندر سے اپنا ٹوکا نکالا اور حاکم کے سامنے آ کھڑا ہوا اور ہونٹ کاٹتے ہوئے اس نے پوچھا۔
میرا ہل کیوں روکا جاتا تھا چودھری
حاکم کیا جواب دیتا بغلیں جھانکنے لگا تھا۔

سلیم نے اس کے چہرے پر ٹوکہ لہرایا۔
چپ رہو گے اور کوئی جواب نہ دو گے تو بڑی بُری موت ماروں گا۔
حاکم نے سر جھکا لیا۔
غلطی تھی میری
میرے بھائی کو قتل کیوں کیا گیا۔
یہ بھی میری غلطی تھی۔
قاتل کون کون تھے۔
وہی جنہیں تم پہلے ہی قتل کر چکے ہو۔
میرے باپو کو کیوں قتل کیا گیا۔ جب کہ وہ بے گناہ اور معصوم تھا۔
حاکم کا سر پھر جھک گیا۔
تم نے میرے باپو کو کہا تھا کہ دیکھوں گا تم کون سا سرخ طوفان بڑا کرتے ہو۔
حاکم نے ایک بار چور نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر گردن جھکا لی۔
سلیم نے اُسے ٹوکے کے دستے سے ٹھوکر لگائی۔
جواب کیوں نہیں دیتے۔ بولو چودھری! آج تمہیں سب کچھ اُگلنا ہوگا۔ بولو کیا تم نے میرے باپو کو کہا تھا۔ دیکھوں گا تم کون سا سرخ طوفان بڑا کرتے ہو۔
مجرموں کے انداز میں حاکم نے جواب دیا۔
ہاں کہا تھا۔

سلیم غصّے میں برس پڑا۔

کیوں کیا تھا۔

اس نے پھر چودھری کو ڈوکے سے ٹھوکر لگائی۔

اِدھر میری طرف دیکھو۔

چودھری اس کی طرف دیکھنے لگا۔

مَیں ہوں وہ سُرخ طوفان جس کی میرے باپو نے تمہیں دھمکی دی تھی۔

تم میرا ہل روکتے رہے۔

مَیں چپ رہا۔

تمہارے آدمی مجھے مارتے رہے۔ حالانکہ وہ میرا ایک ایک ہاتھ بھی برداشت نہ کر سکتے تھے مگر مَیں نے شرافت سے کام لیا۔

تم نے میرا بھائی قتل کر دیا۔ میرا بازو کاٹ دیا۔ مَیں پھر بھی امن پسند رہا۔

تم نے میرے دوسرے تین بھائیوں کو معاشرے کا مجرم اور قاتل بننے پر مجبور کیا۔ مَیں پھر بھی صبر شکر کیے رہا اور شہر جا کر ایک پُرامن شہری کی مانند نوکری کرتا رہا۔

مگر تمہارا اطمینان نہ ہوا۔

تمہارا جی نہ بھرا۔

بھیڑیئے! تمہاری خون کے چاٹ کی عادت نہ گئی۔

تم نے اپنی شرپسند عادت نہ بدلی۔

چودھری حاکم اس کے پاؤں پر گر گیا۔

مجھے معاف کر دو سلیم! مَیں تمہارا مجرم ہوں۔ تمہارا گناہ گار ہوں۔

مَیں نے تمہارے بھائی کو قتل کرایا۔

مَیں نے تمہارے باپو کو قتل کرایا۔

مَیں نے تمہارے بھائیوں کو بغاوت پر مجبور کیا۔

مَیں تمہارا گھر اُجاڑنے کا ذمہ دار ہوں۔

مَیں اندھا ہو گیا تھا سلیم! دولت نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ اس نے اپنا سَر سلیم کے پاؤں پر رکھ دیا۔

مجھے معاف کر دو سلیم! آئندہ کوئی ایسی غلطی نہ کروں گا۔

سلیم نے اسے گردن سے پکڑ کر اُٹھایا اور ایک زور دار گھونسہ اسے رسید کر دیا۔ چودھری حاکم بُری طرح سامنے والے درخت سے ٹکرا گیا۔ سلیم نے اسے کھا جانے والی نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔

تمہیں معاف کر دوں۔

اپنے باپو اور بھائیوں کے قاتل کو چھوڑ دوں۔

تم ـــــ تم انسانیت کے دشمن ہو۔

شرافت پر گندہ داغ ہو۔

پُرامن شہری زندگی کے لیے ایک عذاب ہو۔

عذاب

اور وہ بھی شیطانی عذاب۔

چودھری حاکم نے ہاتھ جوڑے ۔

مجھے پیاس لگی ہے ، پانی تو پلادو ۔

سلیم پیچھے ہٹ گیا ۔

ابھی پلاتا ہوں ۔

اس نے اپنی رائفل نکالی اور میگزین علیحدہ کر کے اس میں سے سپرنگ نکال لینے کے بعد وہ پھر حاکم کے پاس آیا اور ٹوکے سے اس کا ایک ہاتھ کاٹ دیا ۔ خون کا فوارہ پھوٹ نکلا ۔ سلیم نے اس کے خون سے میگزین بھر لی اور پھر اس کی طرف بڑھائی ۔

لو یہ پیو ، اس سے بجھاؤ اپنی پیاس ۔ تم خون کے عادی ہو ۔ مرنے سے پہلے جی بھر کر اسے پی لو ۔

چودھری تکلیف کی شدت سے کراہ رہا تھا ۔

سلیم نے اس کا سر پکڑ کر منہ اوپر کیا اور خون سے بھری ہوئی میگزین اس کے منہ میں الٹ دی اور ایک بھرپور وحشی قہقہہ لگایا ۔

ہا ہا ہا ——

اب صحیح بھیڑیئے دکھائی دیتے ہو ۔

ایک جھٹکے کے ساتھ اس نے پھر ٹوکہ لہرایا اور چودھری حاکم کی گردن کاٹ کر علیحدہ کر دی اور ساتھ ہی زور سے چلایا ۔

رشید ! اس پاپی کی گردن آج سیگر کے اس چوراہے کے درخت سے لٹکا دینا ۔ جہاں سے اردگرد کے سب گاؤں کے لوگ گزرتے

ہیں ۔

رشید نے چودھری کا سر اٹھا کر بورے میں ڈال لیا اور چاروں واپس لوٹ گئے ۔



(٢١)

آج وہ دونوں پھر اپنے تہ خانے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں خاموش اور چُپ تھے ۔ دونوں نے تہ خانے کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا رکھی تھی۔ شاید کسی گہرے مسئلے پر سوچ رہے تھے ۔ سامنے دیوار پر برکت اور چودھری حاکم کے نام کٹے ہوئے تھے اور اب چودھری حاکم کے داماد شفیع کے نام کو نشان لگا ہُوا تھا ۔

نواب نے اپنی بند آنکھیں کھولیں ۔ کچھ دیر تک وہ بڑے غور سے سلیم کو دیکھتا رہا جو آنکھیں بند کیے نہ جانے کہاں پہنچا ہُوا تھا۔ پھر اس نے سلیم کا گھٹنا پکڑ کر ہلایا۔

ہوں ، پھر کیا خیال ہے ۔

سلیم نے چادر سے مُنہ پونچھا۔

تم نے کیا سوچا ہے ۔

تمہاری کیا مرضی ہے۔ تم نے ہمیشہ مجھ سے بہتر سوچا ہے اور تمہاری جس سوچ پر بھی ہم نے عمل کیا ہے اس میں ہم سو فی صدی کامیاب رہے ہیں ۔

تو پھر اُٹھو چلیں شفیع کی طرف آج اس کا نمبر ہے ۔

نواب کھڑا ہو گیا ۔

چلو پھر دیر کاہے کی ۔

دونوں اُٹھ کر باہر آئے ۔ بستی سے جاکر انہوں نے اپنے گھوڑے لیے اور بڑی تیزی سے شفیع کے گاؤں مچھرالہ کی طرف بڑھنے لگے ۔ راستے میں سلیم اچانک رُک گیا۔

اوہو ، مَیں تو ایک چیز بھول آیا ہوں ۔

نواب بھی رُک گیا۔

کیا بھول گئے ہو ؟

رشید کو کچھ روپے دئیے ہوئے تھے مَیں نے رکھنے کے لیے جو چودھری حاکم اور اس کے ساتھیوں کے کپڑوں میں سے نکلے تھے ۔ میری صلاح تھی وہ رقم آج بلقیس کو دے دیتے ہیں ۔ کئی دن ہو گئے ہیں اس بچاری کا ہم نے پتہ ہی نہیں کیا۔ خبر نہیں کس حال

میں ہے۔

نواب نے تسلی دی۔

ٹھیک ہی ہوگی انشاءاللہ پہلے شفیع سے نبٹ آئیں عشاء کی نماز کے بعد ملیں گے بلقیس کے پاس اس کی خیریت بھی پوچھ آئیں گے اور رقم بھی دے آئیں گے۔

سلیم نے پھر گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

چلو یہ بھی ٹھیک ہے۔

چھرالہ گاؤں میں داخل ہوتے وقت سلیم نے گلی میں سے گزرتے ہوئے ایک بوڑھے سے پوچھا۔

بابا! شفیع کا گھر کس طرف ہے۔

بوڑھا کھڑا ہو گیا۔

کون سا شفیع، یہاں تو کئی شفیع ہیں۔

جو سگر کے چودھری حاکم کا داماد ہے۔

وہ تو کئی ماہ ہوئے جیل میں ہے۔

کس جرم میں جیل گیا ہے۔

اس نے اپنے گاؤں میں چار قتل کر دیئے تھے۔

سزا وغیرہ تو نہیں ہو گئی اسے۔

نہیں ابھی تو کچہری میں مقدمہ چل رہا ہے۔

سلیم نے غور سے نواب کی طرف دیکھا۔

اب کیا کریں۔

اب واپس چلیں اور کیا۔

دونوں واپس مڑے اور گاؤں سے نکلنے ہی والے تھے کہ سامنے سے پولیس آگئی۔ نواب آگے آگے تھا۔ اس نے فوراً گھوڑا موڑ لیا اور چلا کر سلیم سے کہا۔

بھاگ چلو، پولیس آگئی۔

نواب اپنا گھوڑا گلی میں سرپٹ چھوڑ چکا تھا۔ سلیم بھی اپنا گھوڑا واپس موڑ کر اسے ایڑ لگا رہا تھا کہ ساتھ والے مکان کی چھت سے پولیس کے ایک انسپکٹر نے اس پر چھلانگ لگا دی۔

سلیم اپنا توازن کھو بیٹھا اور زمین پر گر گیا۔ پولیس کے سپاہی بھاگتے ہوئے آئے اور اسے جکڑ لیا۔ انسپکٹر سلیم کے گھوڑے پر ہی بیٹھا اور اسے نواب کے تعاقب میں سرپٹ چھوڑ دیا۔

نواب اپنے تعاقب میں انسپکٹر کو دیکھ چکا تھا۔ گاؤں سے کوئی ایک فرلانگ دور اس نے ایک کھیت کے کونے کا موڑ مڑا اور گھوڑے کو وہیں چھوڑ کر وہ دوبارہ اسی کونے میں کھیت کے اندر آ کر چھپ گیا۔

انسپکٹر جب کھیت کا کونہ مڑنے لگا تو نواب نے اچانک کھیت میں سے چیتے کی طرح جست لگائی اور انسپکٹر کو زمین پر گرانے کے بعد اسے بے بس کر دیا۔

نواب نے رسّی سے اس کے ہاتھ پشت پر جکڑ دیئے۔ اس کی آنکھوں پر اپنی چادر باندھ دی اور دونوں گھوڑے سرپٹ دوڑاتا ہُوا وہ بستی میں آیا۔ رشید اور اعظم کی مدد سے اس نے انسپکٹر کو تہ خانے میں اُتارا۔

شام تک وہ بھی تہ خانے میں ہی رہا۔ پھر رشید اور اعظم کو انسپکٹر کی نگرانی پر چھوڑ کر وہ باہر نکلا۔ بستی میں آکر اپنا گھوڑا لیا اور عشاء کے بعد وہ بڑی احتیاط سے کام لیتا ہُوا سلیم کے گاؤں سگر آیا اور اس کی حویلی کے دروازے پہ دستک دی۔

کافی دیر بعد گلشن نے دروازہ کھولا اور اندھیرے میں اسے پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے نواب سے پوچھا۔

کون ہے ؟!

اس کی آواز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ روتی رہی ہے۔

مَیں نواب ہوں ماں جی!

گلشن ایک طرف ہٹ گئی۔

اندر آجاؤ بیٹے! تمہارا اس طرح باہر کھڑے رہنا ٹھیک نہیں۔

نواب اندر آگیا۔ اس نے دیکھا برآمدے میں کشور بیٹھی سسک کر رو رہی تھی۔ مکان میں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ کوئی دیا بتی وغیرہ نہ جلائی گئی تھی۔

نواب نے منت کے انداز میں گلشن سے کہا۔

ماں! خدا کے لیے بھابی سے کہو چُپ ہو جائے۔

گلشن نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا

بہت کہا ہے بیٹے! مگر نہیں سنبھلتی وہ۔ اس گھر میں تو اب ہمیشہ کے لیے ہی تاریکی ہو گئی ہے سلیم کو پولیس نے کیا پکڑا ہم دونوں تو جیتے جی ہی مر گئی ہیں۔ تم کھڑے کیوں ہو بیٹا! بیٹھ جاؤ نا چارپائی پر۔

نہیں ——— مَیں بیٹھنے نہیں آیا۔ مَیں اب لوگوں کو یہ بتانے آیا ہوں کہ مَیں سلیم کو ضرور واپس لاؤں گا۔

گلشن نے مایوسی سے کہا۔

کیسے لاؤ گے بیٹا!

نواب خلاؤں میں کھو گیا۔

ضرور لاؤں گا ماں! اس کی خاطر خواہ مجھے عدالت میں کیوں نہ کودنا پڑا مَیں کود جاؤں گا۔ اس کی سلامتی اور رہائی کے لیے مَیں ہر کام کر گذروں گا۔

نواب جذباتی ہو گیا۔

اس کے بغیر نواب نامکمل ہے۔

اس کے بغیر میرا جینا ادھورا ہے۔

وہ میرا بازو ہے اور مَیں اپنے بازو کو کٹنے نہ دوں گا۔ مَیں اُسے لاؤں گا اور ضرور لاؤں گا ورنہ خود بھی ہمیشہ کے لیے کھو جاؤں گا۔ نواب باہر نکلنے لگا۔ مَیں اس لیے آیا تھا کہ آپ لوگ حوصلہ رکھیں۔ میرا دل کہتا

ہے میں اسے ضرور واپس لے کر آؤں گا ۔

گلشن اُسے دعائیں دینے لگی۔

خُدا تمہیں کامیاب کرے بیٹا !

سگر سے نکل کر نواب چاندی کوٹ آیا اور بلقیس کے گھر داخل ہوا وہ دونوں بچّوں کو ساتھ لیے بستر پر بیٹھی شاید انہیں کہانی سنا رہی تھی کوئی - نواب کو دیکھتے ہی وہ کھڑی ہو گئی - اور بڑے پُرتپاک لہجے میں کہا - "آؤ بھیا ! اکیلے ہی ہو کیا ۔"

نواب نے گھوڑا صحن میں چھوڑ دیا اور اس کے قریب آیا۔

ہوں تو اکیلا ہی بہن !

سلیم کہاں ہے ؟

اس کا بھی بتاتا ہوں - پہلے یہ لو۔

اس نے جیب سے کچھ روپے نکال کر بلقیس کی طرف بڑھائے۔

یہ کچھ روپے لایا ہوں تمہارے لیے ۔

بلقیس ہچکچا گئی ۔

رہنے دو بھیّا ! پہلے ہی تم دونوں بھائیوں نے پر بڑا احسان ہے - اس نے صحن میں کھڑے دو بیلوں کی طرف اشارہ کیا ۔

دیکھو تو میں نے بیلوں کی جوڑی بھی لے لی ہے اور ایک بھینس بھی رکھ لی ہے - نادر اب ہل چلاتا ہے اور ساری زمین جوت کر ہم نے بیج بھی ڈال دیا ہے - میں تم دونوں کی احسانمند ہوں بھیّا ! کہ تم

دونوں نے مجھے پھر میرے پاؤں پر کھڑا کر دیا ہے - یہ رقم تم رکھو میرا گزارہ اب ہوتا ہی رہے گا - بس کچھ ماہ کی تکلیف ہے - ایک فصل بھی گھر آ گئی تو میں کسی کی محتاج نہیں رہوں گی ۔

نواب نے رقم اسے زبردستی تھما دی ۔

بہن بھائی کی مدد کرے تو وہ احسان اور بوجھ ہوتا ہے مگر جب بھائی بہن کی مدد کرتا ہے تو یہ احسان نہیں ہوتا بلکہ یہ بھائی کا حق ہوتا ہے جسے وہ ادا کرتا ہے ۔

بلقیس نے رقم لے لی ۔

جواب میں وہ کچھ کہنے والی تھی کہ نادر بول پڑا ۔

ماموں ! بیٹھو نا ۔

نواب نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا ۔

"نہیں بیٹے ! میں ذرا جلدی میں ہوں اور ابھی واپس جاؤں گا ۔

تم نے سلیم کے متعلق نہیں بتایا بھیّا ۔

نواب کی آواز گلوگیر ہو گئی ۔

اسے آج پولیس پکڑ کر لے گئی ہے ۔

بلقیس نے دل پر ہاتھ رکھ لیا ۔

ہائے میرے اللہ ! سلیم کو پولیس لے گئی - اب کیا ہوگا ۔

نادر نے بھی بھرائی سی آواز میں کہا ۔

ماموں گرفتار ہو گئے ۔

میں سلیم کو کسی نہ کسی طرح چھڑانے ہی جا رہا ہوں بہن اُمید ہے میں اس میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ اسی لیے میں تمہیں یہ رقم دینے آیا تھا کہ ہو سکتا ہے کچھ عرصہ کے لیے میں یہاں سے باہر ہی رہوں یا ہو سکتا ہے ہم دونوں ہمیشہ کے لیے ہی یہاں کبھی نہ آئیں ایسی صورت میں تم اس رقم سے اپنی گزر بسر تو کر سکو گی نا۔

بلقیس رو دی۔

خُدا تم دونوں کو زندہ اور سلامت رکھے۔

نواب واپس مُڑ گیا۔

میں اب چلتا ہوں۔

ٹھیرو بھیّا! کھانا تیار کرتی ہوں کھا کر جاؤ۔

نواب کی آواز بھرا گئی۔

سلیم کے بغیر کھانا کیسے سوجھتا ہے بہن!

اس نے اپنے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور باہر نکل گیا۔



(۲۲)

اسی رات نواب شہر آ گیا۔ جیل سے نکل کر جو سڑک عدالت کی طرف جاتی ہے۔ اس راستے پر صدر تھانہ بھی آتا ہے اور تھانے کے ساتھ تحصیل آفس ہے۔ تحصیل آفس کے سامنے ایک چھوٹی سی مسجد ہے جس کے قریب سڑک پر ایک پُلی ہے۔ پُلی کے ایک طرف محکمہ زراعت کا دفتر ہے۔ دوسری جانب ایک پرائیویٹ کلینک کے ساتھ ساتھ کھیتوں کا سلسلہ ہے۔

نواب نے اس کھیت میں گھوڑے کو ایک درخت سے باندھ دیا اور خود پُلی کے نیچے آ کر سو گیا۔

وہ رات اس نے وہیں بسر کی۔ دوسرے روز صبح سویرے ہی اُٹھ

کر مسجد کے اندر چلا گیا اور دیوار کی اوٹ میں ہو کر دیکھتا رہا کہ شاید پولیس والے جیل یا تھانے سے سلیم کو عدالت کی طرف لے جائیں مگر اسے کوئی کامیابی نہ ہوئی۔

اس طرح کئی روز تک اس نے اس مسجد میں بیٹھ کر انتظار کیا کہ شاید سلیم کو لے کر پولیس والے یہاں سے گزریں مگر اسے کوئی کامیابی نہ ہوئی۔

ایک روز نواب صبح سویرے ہی پُلی کے اندر سے نکلا۔ ابھی اندھیرا ہی تھا۔ گھوڑا اس نے کھیت سے باہر لا کر شیشم کے ایک درخت کے ساتھ باندھا اور خود کلینک کے سامنے والے ہوٹل سے اس نے دو آنے کا ایک بند کھایا اور ایک کپ چائے کا پیا۔ تھوڑی دیر تک وہ وہیں بیٹھا رہا۔

جب سورج طلوع ہونے کے قریب آیا اور روشنی ہونے لگی تو وہ وہاں سے اٹھا اور مسجد میں آ کر دیوار کی اوٹ میں آ کھڑا ہوا۔

کوئی آٹھ بجے تک اس نے انتظار کیا ہوگا کہ اسے جیل کی طرف سے سلیم آتا دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ ایک اور قیدی بھی تھا۔ دونوں کو ہتھکڑی لگی ہوئی تھی۔ دو سپاہی رائفلیں اٹھائے ان کے آگے آگے چل رہے تھے اور ایک ان کے پیچھے تھا جس نے ان کی ہتھکڑی اپنی پیٹی میں لگا رکھی تھی۔

سلیم اور دوسرا قیدی جب مسجد کے پاس سے گزرنے لگے تو

...ب نے ایک ہلکی سی اور پر اسرار سیٹی بجائی۔ سلیم کے کان کھڑے ...ے اور اس نے نواب کی طرف دیکھا۔

نواب نے اسی لمحہ ہاتھ لہرا کر اپنے گھوڑے کی طرف اشارہ کیا ...یم کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ وقت ضائع کیے ...اس نے سپاہی کی نظر بچا کر اپنے ساتھی قیدی سے کہا۔

بھاگنا چاہتے ہو تو تم فوراً پیچھے والے سپاہی کی پیٹی سے ...ہتھکڑی کا سرا نکالو اور میں سامنے والے دونوں سپاہیوں ...بھالتا ہوں۔ وہ مسجد کے اس طرف میرے ساتھی کا گھوڑا ...ہے۔ اس پر بیٹھ کر ہم بھاگنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

دوسرا قیدی بھی کوئی تیز اور چالاک دکھائی دیتا تھا۔

تو پھر تیار ہو جاؤ۔ اس نے جرأت کا ثبوت دیا۔

سلیم نے گِنا۔

ایک، دو، تین۔

سلیم سامنے والے ایک سپاہی پر جھپٹا اور پلک جھپکنے ...اس سے رائفل چھین کر اسے پاؤں کی ٹھوکر مارتے ہوئے سڑک ...ے پانی کی گندی نالی میں گرا دیا۔ اتنی دیر تک دوسرا سپاہی ...د ہو چکا تھا۔ سلیم نے اس کے شانے پر رائفل کا بٹ مارا وہ بھی ...ر گر گیا۔ اتنے میں دوسرا قیدی ہتھکڑی کو تیسرے سپاہی کی ...ے علیحدہ کر چکا تھا۔

سلیم نے رائفل وہیں پھینک دی اور دونوں بھاگتے ہوئے مسجد کے قریب سے گزرے اور گھوڑے پر سوار ہونے کے بعد اسے کھیتوں میں سے اندھا دھند ایک طرف پوری رفتار سے بھگانا شروع کر دیا تھا۔

سپاہیوں نے شور کرنا شروع کر دیا تھا۔

قیدی بھاگ گئے۔ پکڑو پکڑو ——

مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ دونوں قیدی کھیتوں کی آڑ میں کافی دُور نکل گئے تھے۔

نواب بچتا بچاتا مسجد سے نکلا۔ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے گلی میں گھسا۔ وہاں سے نکل کر وہ کھیت میں داخل ہوا اور پھر ہسپتال کے پیچھے سے ہوتا ہوا وہ شہر سے باہر جانے والی سڑک پر آیا۔ ایک درخت کے نیچے کھڑے ہو کر تھوڑی دیر انتظار کیا۔ پھر بس آتی دکھائی دی۔ ہاتھ کے اشارے سے اس نے بس رکوائی اور اس میں بیٹھ گیا۔

دوسری طرف سلیم اور دوسرا قیدی دریا کے کنارے والے جنگل میں جا ٹھہرے۔ دونوں گھوڑے سے نیچے اُترے۔ دوسرے قیدی نے سلیم سے پوچھا۔

اب اس ہتھکڑی کو کاٹنے کا کیا بندوبست کریں۔ دن کے وقت ہم کسی لوہار کے پاس بھی نہیں جا سکتے۔

سلیم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

یہ بھی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ تم جاؤ گے کہاں ؟

دوسرے قیدی نے اپنی کلائی پر ہتھکڑی درست کی۔

مَیں تو مچھرالہ جاؤں گا۔

سلیم نے حیرت اور پریشانی سے پوچھا۔

مچھرالہ۔

ہاں مچھرالہ۔ کیوں کیا بات ہے۔

تمہارا نام کیا ہے ؟

نام تو میرا شفیع ہے۔

شفیع ؟

ہاں ——

سگر کے چودھری حاکم کے داماد ہو نا تم۔

ہاں —— پر تم اتنی گہرائی میں کیوں جا رہے ہو۔ تم کہاں جاؤ گے۔

مَیں تو کہیں بھی نہ جاؤں گا۔

پھر بھی کہیں تو تمہیں جانا ہی ہو گا نا۔

یہیں جنگل میں میرا مسکن ہے اور یہیں مجھے رہنا ہے۔

تمہارا نام ؟

میرا نام سلیم ہے۔

شفیع نے پریشانی سے پوچھا۔

سگر کے ہونا تم ۔

ہاں !

شفیع کے چہرے پر نفرت پھیل گئی ۔

پھر تو ہم دونوں میں سے ایک ہی کو زندہ رہنا ہوگا تم چودھ حاکم اور اس کے بیٹوں کے قاتل ہو اور میں تمہیں کسی حالت میں بھی زند نہیں چھوڑ سکتا ۔

سلیم کے مزاج میں بھی غصّہ آگیا تھا۔

میں بھی یہی سوچ رہا تھا ۔ ہم دونوں میں سے ایک کو ہی زند رہنا ہے ۔ تم اس کھوجی کے قاتل ہو جس نے ہمارے گم شدہ بیلوں ک کھوج لگایا تھا اور تم نے ہمارے بیل بھی چرائے تھے اور میرے باپو کے منتیں کرنے کے باوجود واپس نہ کیے تھے ۔ میں بھی تمہیں زند نہیں چھوڑ سکتا ۔

شفیع سنبھل گیا ۔

تو پھر تیار ہو جاؤ موت کا مقابلہ کرنے کے لیے ۔

سلیم بھی مستعد ہو گیا ۔

یہ فیصلہ تو تقدیر کرے گی کہ موت کا سامنا کون کرتا ہے دیہ تمہاری آنکھوں میں مجھے تمہاری ہی موت نظر آرہی ہے میری آنکھ میں بھی جھانکو، ان میں بھی تمہاری ہی موت کے سائے ہوں گے ۔

شفیع نے ہتھکڑی کی زنجیر سمیٹ کر سلیم کو مارنا چاہی ۔

ابھی پتہ چل جاتا ہے کہ کون موت کے منہ میں جاتا ہے ۔

سلیم جست مار کر آگے بڑھا اور اسے زنجیر سمیت اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا ۔

سؤر کی اولاد تمہارا کوئی حربہ بھی میں کامیاب نہ ہونے دونگا ۔

اتنے میں جنگل کے اندر نواب کی آواز گونجی ۔ وہ زور زور سے پکار رہا تھا ۔

سلیم ! سلیم ! کہاں ہو تم ؟

سلیم شفیع کو جکڑے ہی جکڑے زور سے چلّایا ۔

نواب !

شفیع فکر مند ہو گیا تھا ۔ شاید وہ نواب کے پہنچنے سے پہلے ہی سلیم سے فارغ ہو جانا چاہتا تھا ۔ اس لیے اپنے بدن کو ایک زور کا جھٹکا دے کر اس نے سلیم کی گردن پر ہتھکڑی والے ہاتھ کا ایک گھونسہ دے مارا ۔

سلیم زمین پر گر گیا ۔

شفیع نے جلدی جلدی ہتھکڑی کی زنجیر سمیٹی اور اسے لہراتے ہوئے سلیم کو دے ماری ۔

سلیم تڑپ کر ایک طرف ہٹ گیا اور زنجیر کا ایک سرا پکڑتے ہوئے وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور پہلی بار غصے میں خونخوار بھیڑیے کی مانند غرایا ۔

اب دیکھتا ہوں کسے موت پکار رہی ہے ۔

دونوں زور آزمائی کرتے ہوئے ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔

سلیم پھر بولا۔

پورا زور لگا لینا شفیع! میں کھینچنے لگا ہوں تمہیں اپنی طرف

اس کے ساتھ ہی وہ زور سے چلایا۔

ہا ———

ایک سخت جھٹکا لگا اور شفیع سلیم کی چھاتی سے آ لگا۔ زنجیر سلیم نے اس کی گردن کے گرد لپیٹ کر جب زور لگایا تو شفیع کا سانس بند ہو گیا۔ گردن ایک طرف ڈھلک گئی اور وہ ختم ہو گیا۔

سلیم نے لاش کو ٹھوکر ماری اور وہ دور جا گری۔ تھوڑی دیر تک وہیں کھڑے ہو کر اس نے اپنی پیشانی سے پسینہ خشک کیا۔ پھر وہ لاش کو کھینچتا ہوا دریا کے کنارے آیا اور نواب کو آواز دی۔

نواب! نواب!

چند ہی لمحوں بعد نواب جنگل سے نمودار ہوا۔ وہ اپنے گھوڑے پر سوار تھا اور اس نے اپنے پیچھے کوئی اور آدمی بھی بٹھا رکھا تھا۔ سلیم کے پاس آ کر اس نے گھوڑا روکا اور نیچے چھلانگ کر وہ بھاگتا ہوا آگے بڑھا اور سلیم کو گلے لگا لیا۔ لاش پر نظر پڑتے ہی سلیم چونک سا پڑا۔

اس نے یہاں تمہارے ساتھ جھگڑا کرنے کی کوشش کی ہو گی؟

سلیم نے لاش کی طرف دیکھا۔

یہ مچھرالہ کا شفیع ہے۔

نواب نے حیرت کا اظہار کیا۔

یہ ہے شفیع!

ہاں!

چلو اچھا ہوا یہ بھی ختم ہوا۔

سلیم نے ہتھکڑی کی طرف اشارہ کیا۔

پہلے اس کا کچھ کریں۔

نواب مسکرا دیا۔

گھبراتے کیوں ہو۔ میں اپنی بستی کا لوہار چاچا ساتھ لے کر آیا ہوں۔

نواب کے ساتھ آئے ہوئے اس بوڑھے لوہار نے اپنے اوزار زمین پر رکھے اور تھوڑی دیر کی محنت کے بعد وہ ہتھکڑی کاٹنے میں کامیاب ہو گیا۔

تینوں پھر گھوڑوں پر سوار ہوئے اور دریا کے کنارے نیچے کی سمت بڑھنے لگے۔



(۲۲)

شام گھنیر تاریکیوں میں ڈوب گئی تھی۔ سلیم اور نواب تہ خانے میں داخل ہوئے۔ دائیں طرف والی دیوار میں ایک کیل سے لٹکتی ہوئی ایک بتّی جل رہی تھی۔

ایک کونے میں انسپکٹر بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور آنکھوں پر وہی نواب کی چادر بندھی ہوئی تھی۔ رشید اور اعظم دروازے کے دائیں بائیں بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

سلیم اور نواب کے اندر داخل ہوتے ہی رشید اور اعظم کھڑے ہو گئے۔ سلیم نے انہیں ہاتھ سے باہر جانے کا اشارہ کیا اور وہ باہر

نکل گئے۔

نواب نے آگے بڑھ کر پہلے انسپکٹر کے ہاتھ کھولے پھر اس کی آنکھوں سے چادر بھی ہٹا دی۔ انسپکٹر نے آنکھیں ملتے ہوئے گھبراہٹ میں پوچھا۔

کون ہو تم؛

نواب اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

جی میں ہوں آپ کا تابعدار نواب

انسپکٹر گھبرا گیا۔

اور تم!

میں اکیلا نہیں، میرا دوسرا ساتھی بھی ہے جی۔

کون؛

سلیم! جسے آپ کے ساتھی گرفتار کر کے لے گئے تھے۔

انسپکٹر اور پریشان ہو گیا۔

یہ کیسے آ گیا۔

میرا نام نواب ہے انسپکٹر! میں نے زندگی میں کبھی ہار نہیں مانی۔ جس روز میں ایسے حالات سے ہار گیا وہ میری زندگی کا آخری دن ہو گا۔

ایک روز تمہیں پولیس کے سامنے ضرور ہار ماننا ہو گی۔

اب سلیم نے جواب دیا۔

ہمارا ایک مشن ہے انسپکٹر! جب وہ پورا ہو جائے گا ہم خود ہی اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ مَیں نے آج تک کسی بے گناہ کو قتل نہیں کیا۔ ہم نے ہمیشہ مجرموں کو ٹھکانے لگایا جن کی پولیس کو بھی تلاش تھی۔

کیا تم نے چودھری حاکم اور اس کے آدمیوں کو قتل نہیں کیا۔

کیا ہے۔

کیا تم نے مرالہ کے برکت کو نہیں مارا

مارا ہے۔

کیا تم نے ـــــــــ

کیا تم نے چاندی کوٹ کے دو بھائیوں کے ساتھ ان کے چھ ساتھی بھی ٹھکانے نہ لگائے تھے۔

ضرور لگائے تھے۔

پھر تم کیسے کہتے ہو کہ تم نے کسی بے گناہ کو قتل نہیں کیا۔

کیا تمہارے خیال میں چودھری حاکم بے گناہ تھا۔

مرالہ کا برکت شریف انسان تھا۔

چاندی کوٹ کے وہ دو جوان انسانیت کے حامی تھے۔

بالکل وہ سب معزز اور پُرامن شہری تھے۔

تم غلط کہتے ہو انسپکٹر! چودھری حاکم اور اس کے آدمی میرے بھائی نصیر کے قاتل تھے۔ برکت نے میرے تین دوسرے بھائیوں کو قتل

کیا تھا اور چاندی کوٹ کے ان دو بھائیوں نے ایک بیوہ اور غریب عورت کی زمین پر زبردستی قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے ہماری مدد سے ان کی یہ کوشش ناکام بنا دی جس کے نتیجے میں ان ذلیلوں نے اس عورت کو اغوا کر کے اس کی عزت سے کھیل جانا چاہا۔ کیا اب بھی تم انہیں معزز شہری ہی کہو گے۔

پر تمہارے بھائی کے قاتل تو اور تھے۔

وہ سب چودھری حاکم ہی کے آدمی تھے۔

قانون نے اُنہیں بے گناہ بھی ثابت کر دیا تھا۔

سلیم چلا اٹھا۔

قانون! قانون! قانون۔

وہ قانون ہی کیا جو انصاف نہ دے سکے۔

وہ انصاف ہی کیا جو اپنا ترازو درست ہی نہ رکھ سکے۔

انصاف تو بکتا ہے انسپکٹر!

تم غلط کہتے ہو۔

غلط کیوں کہتا ہوں۔ کیا انصاف دینے کے بہانے لوگوں نے دوکانیں نہیں کھول رکھیں۔ سب کو پتہ ہوتا ہے کہ مجرم کون ہے۔ قاتل کون ہے۔ پر پھر بھی کیس لڑے جاتے ہیں۔ بے گناہوں کی دولت سمیٹی جاتی ہے۔

انصاف اب دولت کے شطرنج کا ایک حقیر مہرہ بن کر رہ گیا ہے انسپکٹر! ہم نے آج تک اگر کسی بے گناہ کو قتل کیا ہوتا تو جس طرح تم نے

ہمیں پکڑنے کی کوشش کی تھی ہم تمہیں بھی اب تک قتل کر سکتے تھے۔
مگر نہیں انسپکٹر!

تم سرکاری ملازم ہو تم اپنا فرض ادا کر رہے ہو۔ ہم تمہاری وردی کی عزت کرتے ہیں۔ اس لیئے تم پر ہاتھ اٹھانا اچھا نہیں سمجھتے۔ ہم تمہیں یہ دھمکی بھی نہیں دیتے کہ تم ہمیں آئندہ پکڑنے کی کوشش نہ کرنا۔ تم اپنی کوشش کرو ہم اپنا مشن جاری رکھیں گے اور جب یہ پورا ہو گیا ہم خود تمہارے پاس آ جائیں گے۔

دیکھو نا انسپکٹر! میں ایک گریجویٹ ہوں۔ ایک پُر امن شہری کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ نوکری نہ ملنے پر میں نے اپنا ہل چلانا شروع کیا دیا۔ چودھری حاکم کی شروع سے یہ عادت تھی کہ وہ اپنے مویشی لوگوں کے کھیتوں میں کھلا چھوڑ دیا کرتا تھا۔ میرے بھائی نے جب اسے منع کیا اور اس کے راستے کی دیوار بن گیا تو چودھری نے اسے قتل کرا دیا۔

سلیم کی آواز گھگیا گئی۔

میں نے پھر بھی صبر کیا انسپکٹر! اور پُر امن ہو کر اپنے کھیتوں میں ہل چلانے لگا مگر چودھری کا ظلم سے جی نہ بھرا تھا۔ اس کے آدمیوں نے میرا ہل بھی روکنا شروع کر دیا۔ مجھے کئی بار مارا پیٹا گیا۔ مگر میں نے پھر بھی صبر ہی کیا انسپکٹر! ——— مگر

مگر کب تک انسپکٹر! میرے بھائیوں کو اس کا پتہ چل گیا۔ آخر وہ میرے بھائی تھے، میرا خون تھے۔ میرا بازو تھے وہ تینوں گھر آ گئے

ر مجھے زبردستی شہر میں نوکری کرا دی۔ بعد میں چودھری نے ان کا ہل بھی رکا جسے وہ برداشت نہ کر سکے اور انہوں نے بھی چودھری کے آدمی تل کر دیئے۔

مفرور ہو کر وہ مرالہ کے برکت کے پاس چلے گئے۔ اس کا کاروبار ا کہ وہ مفرور مجرموں اور قاتلوں کو اپنے ہاں پناہ دیتا تھا اور جب ہیں سے کوئی مجرم اشتہاری قرار دیا جاتا اور اس کا انعام مقرر ہو جاتا تو اس کا سر کاٹ کر انتظامیہ کو پیش کر دیتا اور رقم وصول کر لیتا تھا اور ب تک وہ اشتہاری قرار نہ دیئے جاتے تھے۔ ان سے اور قتل کراتا ڈاکے ڈلواتا تھا تاکہ وہ جلدی اشتہاری مجرم قرار دیئے جائیں اور ی کا مال بھی ہضم کر جاتا تھا۔ میرے تینوں بھائیوں کو بھی اس نے ے ہی قتل کر دیا۔

سلیم کی آواز یکسر ہی ڈوب گئی۔

میرا بھی صبر دیکھو انسپکٹر! اس قدر ظلم پر بھی میں خاموش رہا اور ہیں نوکری کرتا رہا۔ اس دوران جب میرے دادا نے اپنی زمین ایک ں کو حصے پر دینا چاہی تو چودھری حاکم اور اس کے آدمیوں نے پھر ہل انے دیا۔ اس پر بات بڑھی اور انہوں نے میرے باپو کو قتل کر دیا۔

سلیم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

میرا باپو بوڑھا اور بے گناہ تھا۔ میں یہ غم برداشت نہ کر سکا اور ا ہو گیا۔ میں نے چودھری حاکم اور اس کے آدمیوں کو قتل کیا۔ برکت

کو بھی ٹھکانے لگایا۔

جذبات میں ڈوب کر سلیم چلا اٹھا۔

اب تم ہی بتاؤ انسپکٹر!

کیا حالات نے مجھے قاتل نہیں بنایا۔

کیا ان ظالموں نے مجھے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے پر مجبور نہیں کیا۔ نہ یہ ظلم کرتے نہ میں باغی ہوتا۔

ایسے لوگوں کو کوئی پوچھنے والا نہیں انسپکٹر! دولت کے نشے میں اندھے ہاتھیوں کی مانند یہ لوگ غریبوں کی عزت اور جان و مال کو روندتے پھرتے ہیں۔ کوئی اگر ایسے لوگوں کو روکے، کوئی انہیں سدھارے تو کیوں آئے روز ظلم ہوتے ہیں۔ کیوں لوگ قانون کو اپنے ہاتھ میں لیتے رہیں۔

انسپکٹر نے ایک لمبی اور سرد آہ بھری۔

تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمارے معاشرے کی تباہی اور بربادی کا ذمہ دار یہی طبقہ ہے۔

اب نواب بولا۔

تم نے کھانا کھا لیا ہے انسپکٹر!

ہاں کھا لیا ہے

نواب آگے بڑھا، پہلے کی طرح اس کے ہاتھ پشت پر باندھنے کے بعد آنکھوں پہ چادر بھی باندھ دی اور پھر بڑی ہمدردی سے کہا۔

ہم مجبور تھے انسپکٹر! معاف کرنا ہم نے تمہیں اتنے دن یہاں روکے رکھا۔ ہم جانتے ہیں تمہاری بیوی بچے کس قدر پریشان ہوں گے۔ ہم آج تمہیں یہاں سے نکال رہے ہیں۔

دونوں نے انسپکٹر کو اٹھا کر تہ خانے سے باہر نکالا۔ وہاں سے وہ بستی میں آئے اور اپنے گھوڑے باہر نکالے۔ نواب نے انسپکٹر کو اپنے آگے بٹھا لیا۔

کھیتوں میں وہ ایک طرف اندھا دھند گھوڑے دوڑاتے رہے اور اپنے ٹھکانے سے کوئی دس میل دور انہوں نے انسپکٹر کو اتار دیا۔

سلیم نے بڑی ہمدردی سے کہا۔

جاؤ انسپکٹر! اب تھانے چلے جاؤ اور ہاں مچھرالہ کا شفیع جو جیل میں تھا اسے ہم نے قتل کر دیا ہے۔ اسے تلاش کرنے کی زحمت نہ کرنا۔

انسپکٹر چلا گیا۔ وہ دونوں ہوا سے باتیں کرتے ہوئے گھر آئے

سلیم نے اپنے دروازے پر دستک دی۔ گلشن نے دروازہ کھولا اور سلیم کو پہچان کر اسے جی بھر کر پیار کیا۔ پھر وہ انہیں برآمدے میں لائی اور آہستگی سے سلیم کو کہا۔

اس پرلے کمرے میں کشور ہے بیٹا! مل لو اسے۔ تم ادھر آجاؤ نواب! اس نے نواب کو دوسرے کمرے میں لا بٹھایا۔

سلیم کشور کے کمرے میں داخل ہوا وہ گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔

سلیم اس کے پلنگ کے قریب آیا اور کشور کا کان پکڑ کر آہستہ آہستہ ہلایا۔ کشور فوراً اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ جونہی اس نے سلیم کو اپنے سامنے کھڑا دیکھا وہ ایک دم اُٹھی اور سلیم سے لپٹ گئی۔ اس کے ہونٹوں پر بے پایاں خوشی تھی۔

کب آئے آپ؟

میں ابھی ابھی آیا ہوں۔

اس نے کشور کے بال چوم لیے۔

نواب بھائی کہاں ہے؟

میرے ساتھ آیا ہے۔ ادھر ساتھ والے کمرے میں ہے۔

نواب بھائی نے نکالا ہے نا آپ کو قید سے۔

ہاں ——۔

اس نے واقعی اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔ جب پولیس والے آپ کو پکڑ کر لے گئے تھے تو وہ ہم سے وعدہ کر کے گیا تھا کہ یا تو سلیم کو واپس لے کر آؤں گا یا خود بھی ختم ہو جاؤں گا۔

ہاں کشور! وہ ایک مخلص دوست اور دردمند بھائی ہے۔

چلو اس کمرے میں ہی چلتے ہیں۔

کشور نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

چلیے ——

دونوں دوسرے کمرے میں داخل ہوئے۔ کشور نے نواب کو

سلام کیا اور اس نے بڑے تپاک سے جواب دیا۔ کشور باہر جانے لگی۔

آپ لوگ بیٹھیں میں کھانا تیار کرتی ہوں۔

نواب کھڑا ہو گیا۔

نہیں بہن! ہم جا رہے ہیں۔ ہمارا اس طرح باہر رہنا خطرناک ہے تم دونوں تیاری کرو اور ہمارے ساتھ چلو۔

کہاں چلیں بیٹا! گلشن نے پریشانی سے پوچھا۔

بس آپ تیاری تو کریں نا۔ ہم دونوں بھائیوں نے ایک بہن بنا رکھی ہے۔ وہ چاندی کوٹ میں اپنے دو بچوں کے ساتھ رہتی ہے۔

ماں! آپ کو ہم وہاں چھوڑ جائیں گے۔ رات آپ اس کے پاس ہی رہیں گی۔ ہاں کشور ہمارے ساتھ ہمارے ٹھکانے پر جائے گی اور رات سلیم کے پاس رہے گی۔ دوسرے روز شام کے قریب ہم اس کے گھر چھوڑ جائیں گے۔ اب آپ جلدی کریں، دیر ہو رہی ہے۔

ایک گھوڑے پر گلشن اور کشور سوار تھیں اور دوسرے پر سلیم اور نواب۔ اس حالت میں وہ چاندی کوٹ میں داخل ہوئے۔ سلیم نے دروازے پر دستک دی۔ نادر نے اُٹھ کر دروازہ کھولا اور سلیم سے لپٹ گیا۔

تم آ گئے ہو ماموں۔ پھر وہ بھاگتا ہوا اندر گیا اور بلقیس کو جگایا۔

امی دیکھو تو سلیم ماموں آ گئے ہیں۔

بلقیس تیزی سے اُٹھی۔ سلیم اس کے سامنے جھکا اور اس نے سلیم کی پیشانی چوم لی۔

تم آ گئے ہو بھیا !

سلیم مسکرا دیا۔

بس تمہاری دعائیں اور نواب کی ہمت رنگ دکھا گئی ہے بہن!

نواب نے گلشن اور کشور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

بہن ! یہ سلیم کی امی اور یہ اس کی بیوی ہے۔

بلقیس نے ان دونوں کے ہاتھ پکڑ لیے۔

میری بھی یہ ماں اور بھابی ہیں۔

جب وہ دونوں کو اندر لے جانے لگی تو نواب نے روک دیا۔

ماں آج تمہارے پاس ہی رہے گی بہن۔ ہاں کشور سلیم کے ساتھ ہمارے ٹھکانے جائے گی۔ ہم ضرور تمہارے پاس رکتے پر تم جانتی ہو ہمارا کہیں بھی ٹھہرنا خطرناک ہے۔ چلو بیٹھو کشور چلیں۔

بلقیس گلشن کو اندر لے گئی۔

کشور سلیم کے آگے گھوڑے پر بیٹھ گئی اور اس طرح وہ پھر بھٹے پہ آئے۔ گھوڑے سے اترتے ہوئے نواب نے کہا۔

تم دونوں اندر چلے جاؤ۔

اور تم ——— !

سلیم نے پوچھا۔

میں دونوں گھوڑے بستی میں چھوڑ کر یہیں آ کر بھٹے کے مزدوروں کے پاس سو رہوں گا۔

نواب گھوڑے لے کر بستی کی طرف چلا گیا اور سلیم کشور کو لے کر تہ خانے میں اتر گیا۔

(۲۴)

سلیم اور نواب اپنے گھوڑے خوب تیز دوڑاتے ہوئے ایک طرف جا رہے تھے۔ اُن کا رُخ دریا کے کنارے جنگل کی طرف تھا۔

برساتی نالے کے کنارے جب وہ پہنچے تو ایک ضعیف عورت اُن کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی اور ہوا میں ہاتھ لہراتے ہوئے اُنہیں رُکنے کو کہا۔

نواب نے غور سے سلیم کی طرف دیکھا۔

رُک جاؤ ——— سلیم نے فیصلہ دیا۔

دونوں اس بوڑھی عورت کے پاس آ کھڑے ہوئے سلیم گھوڑے سے اُتر کر اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔

ہم سے کوئی کام ہے ماں!

بڑھیا کا چہرہ اُترا ہوا تھا اور بیچاری کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ تھوک نگلتے ہوئے بڑی مشکل سے اس سے کہا۔

میرا نام زینب ہے بیٹے اور مرالہ کی رہنے والی ہوں۔ تم لوگ کون ہو؟

ہم سے کوئی کام ہے۔

پہلے یہ بتاؤ تم دونوں کون ہو پھر میں بتاؤں گی۔

میرا نام سلیم ہے اور یہ نواب ہے۔

بڑھیا رو پڑی۔

بس میں بھی یہی نام سُننا چاہتی تھی۔

ہم سے تمہیں کوئی دُکھ پہنچا ہے ماں۔

نہیں بیٹے! میں تم سے مدد کی درخواست کرنے آئی ہوں۔ آج پورا مہینہ ہو گیا ہے تم دونوں کو تلاش کرتے کرتے۔ تھک گئی ہوں میرے بچو! میں تو اب

کس نے تمہیں دُکھ دیا ہے ماں!

مرالہ کے چودھری برکت کو جانتے ہو۔

خوب جانتا ہوں، میں نے ہی اُسے قتل کیا تھا۔

اس کا ایک چھوٹا بھائی ہے اس کا نام منظور ہے۔ کسی شریف اور غریب آدمی کی عزت اس کے ہاتھوں محفوظ نہیں۔ میری ایک ہی

بیٹی ہے۔ وہ بدمعاش آج سے دو ماہ قبل سب لوگوں کے سامنے میری لڑکی کو میرے گھر سے دن دہاڑے اُٹھا کر لے گیا۔ مَیں بہت روئی پیٹی، پر میری کسی نے نہ سُنی۔

علاقے کے سارے بڑے بڑے چودھریوں اور معتبروں کے مَیں نے پاؤں تک پکڑے پر کسی نے مجھے میری بیٹی واپس نہ دلائی۔

اس ظالم نے میری پھُول سی معصوم بچی کو پورا ایک ماہ اپنے پاس رکھا اور اس کی عزت لُوٹتا رہا اور پھر اسے خود بخود میرے گھر چھوڑ گیا۔ کسی نے میری مدد نہیں کی کہ اس سے باز پرس ہی کرے کہ ہم پہ یہ ظلم کیوں کیا۔ کوئی میرا بیٹا ہوتا تو اس سے ضرور اپنی بہن کا بدلہ لے لیتا۔

اب مَیں تمہارے پاس آئی ہوں کہ تم دونوں ہمارا انصاف کرو

بڑھیا نے اپنے سر سے دوپٹہ اُتار کر سلیم کے قدموں پر رکھ دیا۔

انکار نہ کرنا بیٹے! میری طرح تمہاری بھی کوئی بوڑھی ماں ہوگی۔ میرے دوپٹے کو اس کا دوپٹہ سمجھ کر ہی اس کی شرم رکھ لو۔

نواب رو پڑا تھا۔

سلیم نے دوپٹہ اُٹھا کر زینب کے سر پہ رکھ دیا۔

تمہارے اس دوپٹے کی قسم ماں! مَیں اس پاپی کو زندہ نہ چھوڑوں گا۔

نواب نے بھی غصے میں اُبلتی ہوئی آواز میں کہا۔

ہم ——— ہم اس کا سر کاٹ کر تمہارے قدموں میں ڈال دیں تو نواب اور سلیم نہ کہنا کہتے۔ ہم اسے بتائیں گے کہ دوسروں

اتنی سستی نہیں۔

اس وقت وہ کہاں مل سکتا ہے ماں۔

سلیم نے دریافت کیا۔

شہر سے باہر ایک میلہ لگتا ہے شاہ جہانگیر، وہ آج اس میلے میں گیا ہے۔

ہم تو اُسے جانتے نہیں پہچانیں گے کیسے؟

اس کی لمبی لمبی مونچھیں ہیں، رنگ سانولا، ناک پتلی اور لمبی، پیشانی کے بائیں جانب زخم کا ایک نشان، سر پر سفید پگڑی۔ زیبِ تن گلابی رنگ کی ریشمی قمیض اور اسی کپڑے کی چادر باندھے ہوئے ہے۔

بس بس ماں! اب ہم اسے پہچان لیں گے۔ تم اپنے گھر جاؤ ہم اسے لے کر تمہارے گھر ہی پہنچ جائیں گے اور ہاں تمہارا گھر کس طرف ہے۔

مسجد کے عین سامنے تین مکان ہیں۔ ان میں سے درمیان والا میرا ہے۔

دونوں نے اپنے گھوڑوں کی باگیں موڑ لیں۔

اچھا تم جاؤ۔

دوپہر کے قریب وہ میلے میں داخل ہوئے۔ لوگوں کا ایک بے پناہ ہجوم تھا وہاں۔ ان گنت دکانیں دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھیں موت کے کنوئیں والے۔ ہوائی جہازوں کے پنگھوڑوں والے، چڑیا گھر

والے ۔ پانی کی جل پری دکھانے والے، سرکس والے اور گانے والے، تھیٹر، لاؤڈ سپیکر میں خوب شور کر رہے تھے ۔ زنخوں کی خوب بن آئی تھی ہر طرف لکڑی کے تختوں پر خوب ناچ ٹاپ رہے تھے۔

کافی دیر تک وہ اِدھر اُدھر گھومتے رہے پر منظور اُنہیں کہیں بھی دکھائی نہ دیا۔

تربوزوں کے ایک ڈھیر کے پاس سے گزرتے ہوئے سلیم نے کہا ۔ تربوز نہ کھائیں نواب !

نواب گھوڑے سے اُتر گیا۔

کھا لیتے ہیں ۔

سلیم بھی نیچے اُتر گیا۔

دونوں نے پسند کر کے ایک خاصا بڑا تربوز خریدا اور قریب ہی ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر کھانے لگے ۔ جب اس میں پانی جمع ہو جاتا تو سلیم اُٹھا کر پیتا جاتا ۔ تربوز جب ختم ہو گیا تو نواب نے چادر سے منہ پونچھتے ہوئے پوچھا۔

بس !

سلیم نے بھی اپنی چادر سے ہاتھ منہ صاف کیا۔

بس اور کیا۔ اتنا بڑا تربوز تھا جو ہم نے کھایا ہے ۔ اب اٹھو اس سالے کو تلاش کریں۔

ایک بار وہ پھر اسے تلاش کرنے لگے ۔ بازار سے باہر درختوں

کے ایک جھنڈ کے نیچے کافی لوگ جمع تھے اور وہاں تین چار ڈھول بھی بج رہے تھے۔

وہ دونوں وہاں کھڑے ہو گئے ۔ انہوں نے دیکھا لوگوں کے ہجوم کے اندر کچھ جوان پتھر اُٹھا رہے تھے ۔ وہ دونوں پہچان گئے ان میں منظور بھی تھا۔

سلیم نے نواب سے سرگوشی کی ۔

گھوڑے ایک طرف ہی باندھ دیتے ہیں ۔ یہ اس کے بھائی کے گھوڑے ہیں وہ ضرور پہچان لے گا ۔

نواب نے دونوں گھوڑے کیکر کے ایک درخت کے نیچے کھڑے کر دیئے اور دونوں ہجوم کے اندر داخل ہو گئے ۔

منظور اس وقت ایک بھاری بھرکم پتھر اُٹھانے لگا تھا۔ ایک جھٹکے کے ساتھ اس نے پتھر اُٹھایا اور سَر سے اُوپر لے جا کر زمین پر پھینک دیا۔

سلیم اس کے سامنے جا کھڑا ہوا ۔ منظور نے اسے طنزاً کہا

اٹھاؤ بھئی تم بھی پتھر۔

سلیم نے پتھر کو ہاتھ ڈالا ۔

اس نے بہت کوشش کی مگر پتھر اس سے چھاتی کی سیدھ سے اُوپر نہ جا سکا۔ ناچار اس نے پتھر زمین پر پھینک دیا۔

منظور سمیت وہاں پتھر اُٹھانے والے سارے جوانوں نے

ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔ منظور نے ہنستے ہوئے کہا۔

دیکھو! کتنا بڑا جوان ہے اور یہ پتھر نہیں اُٹھا سکا۔

اب نواب بھی منظور کے سامنے آ کھڑا ہوا اور غصہ ملی جلی آواز میں کہا۔ پتھر صرف زور سے نہیں اُٹھتا دوست! یہ ڈھنگ سے اُٹھایا جاتا ہے۔ لو میں تمہیں اُٹھا کر دکھاتا ہوں۔ تم نے دونوں ہاتھوں سے اُٹھایا ہے اور میں تمہیں ایک ہاتھ سے ہی اُٹھا کر دکھاتا ہوں۔ جہاں تک طاقت کا تعلق ہے تو وہ مجھ سے بھی زور آور ہے۔

نواب نے بسم اللہ کر کے پتھر کو ہاتھ ڈالا۔ پھر اس نے زور کا نعرہ مارا۔ حیدرؓ!

اس کے ساتھ ہی اس نے پتھر ایک ہاتھ سے اُٹھا کر اپنے سر کے اوپر لہرا دیا۔ اردگرد کھڑے سارے لوگ تالیاں بجانے لگے تھے۔

نواب نے پتھر زمین پر پھینک دیا۔

بس تسلی ہوگئی تمہاری؟

کون ہو تم؟ منظور نے غصے میں پوچھا۔

نواب پیچھے ہٹ گیا۔

اس بات کو چھوڑو تم۔

جونہی نواب پیچھے ہٹا۔ اس کی جگہ سلیم آ کھڑا ہوا۔ دونوں اپنی سوچی سمجھی سکیم کے تحت کام کر رہے تھے۔ نگاہوں ہی نگاہوں میں ہر بات سمجھائی جا رہی تھی۔ نواب جا کر گھوڑے پر سوار ہو گیا سلیم

نے منظور کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

اسے کیا کہتے ہو مجھ سے بات کرو۔ مجھے تم سے ایک ضروری کام ہے۔ ذرا میرے ساتھ علیحدگی میں آؤ۔ تمہارا بڑا بھائی برکت میرا دوست تھا۔ اس کے قتل کے سلسلہ میں تم سے میں چند اہم باتیں کرنا چاہتا ہوں۔

منظور سوچنے لگ گیا۔

سلیم اس کا ہاتھ پکڑ کر لوگوں کے ہجوم سے باہر لے آیا۔

سوچنے کیا لگ گئے ہو، میری بات تو سنو۔

منظور نے جب اپنے بھائی کے دونوں گھوڑے دیکھے تو وہ چونک پڑا۔

یہ گھوڑے تم لوگوں نے کہاں سے لیے ہیں۔

سلیم اسے اس گھوڑے کے قریب لے آیا جس پر نواب سوار تھا۔

ان کے متعلق ہی تو میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔

جلدی بتاؤ ورنہ میں ابھی اپنے سارے ساتھیوں کو جمع کر کے تم سے خود پوچھ لیتا ہوں

اسی لمحہ سلیم اس پر شاہین کی مانند جھپٹا اور اسے اُٹھا کر نواب کے آگے پھینک دیا۔

نواب نے اسے اپنے سامنے ایسے دبوچ لیا جیسے چیل اپنے پنجوں

میں مُرغی کے بچّے کو دبوچ لیتی ہے ۔ ساتھ ہی نواب نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی اور وہ چاروں ٹانگیں اُٹھا کر بھاگ کھڑا ہُوا ۔

سلیم نے بھی بھاگ کر ایک لمبی جست لگائی اور اس کا گھوڑا بھی نواب کے پیچھے پیچھے ہو لیا ۔ لوگ شور کرتے رہ گئے اور وہ دونوں یہ جا وہ جا نظروں سے اوجھل ہو گئے ۔

منظور کو لے کر وہ جنگل میں آئے ۔ سلیم منظور کی نگرانی کے لیے کھڑا کر دیا اور نواب جا کر بوڑھی زینب اور اس کی بیٹی کو لے آیا ۔ وہ دونوں جب سلیم کے پاس آ کر اُتریں تو سلیم نے قہر آلود نگاہوں سے منظور کو گھورتے ہوئے پُوچھا ۔

اِن دونوں کو جانتے ہو تم ؟

منظور کا رنگ پھیکا ہو گیا ۔

یہ دونوں ماں بیٹی ہیں اور میرے گاؤں کی ہیں ۔

ان سے تمہارا کوئی جھگڑا ہے ۔

ہرگز نہیں ان سے میرا جھگڑا کیسا ؟

ان کے ہاتھوں تمہیں کبھی کوئی نقصان پہنچا ہو ۔

بالکل نہیں ۔

سلیم نے اس کے مُنہ پر طمانچہ دے مارا ۔

پھر تم نے اس لڑکی کی عزّت کیوں لُوٹی ۔

کس نے بتایا تمہیں ؟

سلیم نے ایک اور طمانچہ دے مارا ۔

تو مَیں جھُوٹ بول رہا ہوں ۔

یہ سراسر الزام ہے ۔ مَیں نے اس لڑکی کی عزت نہیں لُوٹی انہوں نے ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت مجھ پر الزام تراشی کی ہے ۔

سلیم نے اپنے گھوڑے کی زین سے ٹوکا اُتار لیا اور اس کی گردن پہ لہرایا ۔

الزام تراشی ہے یہ ؟

منظور کو پسینہ آ گیا ۔

مَیں نے جھُوٹ بولا تھا ۔ تم ٹھیک کہتے ہو ۔ میری تم سے التجا ہے کہ مجھے یہ بتا دو یہ دونوں گھوڑے تم لوگوں نے کہاں سے لیے ہیں ۔

سلیم نے ٹوکا اس کی ناک سے لگا دیا ۔

اسے سونگھو، کیا اس میں تمہیں اپنے بھائی برکت کے خُون کی بُو آتی ہے ۔

منظور غصّے میں بپھر گیا ۔

تم نے میرے بھائی کو قتل کیا تھا ۔

ہاں ، مَیں جھُوٹ کیوں بولوں ۔

منظور نے سلیم کو ایک زوردار گھونسہ اس کے مُنہ پہ دے مارا

سلیم تلخ ہنسی ہنس دیا ۔

بس ـــــ اس کے ساتھ ہی اس نے منظور کے پیٹ میں

ایسا گھونسہ مارا کہ وہ دو تین بل کھا کر کئی گز دور جا گرا۔

سلیم نے اسے بالوں سے پکڑ کر اوپر اُٹھایا۔

کیوں کچھ ہوش ٹھکانے آئے۔ میلے میں پتھر اُٹھانا آسان تھا لیکن یہاں میرے شکنجے میں پنجا ڈال کر اپنا آپ بچانا ذرا دشوار ہے۔

منظور اُٹھا اور ہانپنے لگا۔

سلیم پھر اس کے قریب آیا۔

تم نے ہمارا نام وغیرہ نہیں پوچھا۔

تھوک نگلتے ہوئے منظور نے پوچھا۔

کون ہو تم؟

میں سلیم ہوں اور یہ نواب۔

جانتے ہو؟

خوب جانتا ہوں۔

اس کے ساتھ ہی سلیم نے ٹوکا لہرا کر مارا اور منظور کی گردن کٹ کر دور جا گری۔ سلیم نے اس کی لاش ٹانگوں سے پکڑ کر لہرائی اور دریا میں پھینک دی۔ پھر اس کا سر بالوں سے پکڑا اور اسے بھی لہرا کر دریا میں پھینک دیا۔

اپنا ٹوکا اس نے زین سے لٹکاتے ہوئے زینب سے کہا۔

لو ماں! ہم نے تم سے کیا ہوا اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔ تم نے ہمیں بیٹا کہہ کر مدد کے لیے پکارا تھا سو ہم نے تمہارے سامنے اس

پاپی کو ختم کر دیا ہے۔ اب اس علاقے میں کوئی کسی کی عزت لوٹنے والا منظور نہ ہوگا۔

نواب نے زینب سے کہا۔

بیٹھو ماں! ہم تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آئیں۔ ساتھ ہی اس نے کچھ روپے نکال کر زینب کو دے دیئے۔

یہ بھی رکھ لو ماں! یہ سمجھنا کہ تمہارے بیٹوں نے تمہیں دیئے ہیں۔ زینب نے روپے لے لیے اور دونوں ماں بیٹی ایک گھوڑے پر بیٹھ گئیں۔

دوسرے گھوڑے پر سلیم اور نواب چڑھ گئے اور دونوں گھوڑے جنگل سے نکل کر دلکی چال مرالہ کی طرف بڑھنے لگے۔



(۲۵)

شام ہونے والی تھی۔ فضا دھواں دھواں سی ہو گئی ہوئی تھی۔
زینب اور اس کی بیٹی کو ان کے گھر چھوڑ کر سلیم اور نواب اپنے ٹھکانے کی طرف جا رہے تھے کہ انہیں اپنے سامنے دریا کے کنارے کنارے مویشیوں کا ایک بہت بڑا غول جاتا ہوا دکھائی دیا۔ مویشیوں کے ساتھ گھوڑوں پر سوار چھ جوان بھی تھے۔ اور ان کے پاس رائفلیں بھی تھیں۔

سلیم نے نواب سے کہا۔

یہ لوگ کون ہیں؟

نواب ان کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔

میں بھی ان کے متعلق ہی سوچ رہا ہوں۔

مجھے تو یہ مویشیوں کے چور دکھائی دے رہے ہیں۔

خیال میرا بھی یہی ہے۔

پھر چلو ذرا پوچھیں ان سے۔

دونوں نے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور ان میں سے سب سے پیچھے والے جوان کے پاس آ رکے۔ سلیم نے بڑی نرمی سے پوچھا۔

اتنے سارے مویشی کہاں لے جا رہے ہو بھائی۔

اس نے کچھ دیر تک مشکوک نگاہوں سے سلیم کو دیکھنے کے بعد رکھائی سے جواب دیا۔

تمہیں کیا؟

نواب بھی اس کے پہلو بہ پہلو آ گیا۔

بتا دو میرے بھائی! کس کے ہیں۔ یہ مویشی اور کہاں جائیں گے۔

وہ اور چڑھ گیا۔

کیوں بتاؤں؟

کیا حرج ہے۔

حرج ہو یا نہ ہو میں نہیں بتاتا۔

نواب نے ریوالور نکال کر سیدھا کر لیا۔

بتاتے ہو یا کھلاؤں دو پیسے کی گولیاں۔

اس نے اپنی رائفل پر ہاتھ لے جانا چاہا مگر اسی لمحہ نواب اس کے قریب آگیا اور اپنے ریوالور کی بیرل اس کی پسلیوں پر رکھ دی۔

اُگل دو جو کچھ ہم پوچھتے ہیں ورنہ یاد رکھو۔ تمہارے دوسرے ساتھیوں کو پتہ بھی نہ چلے گا اور ہم تمہیں موت کی نیند سُلا چکے ہوں گے۔ شور بھی کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ ایسا کرو گے تم صرف اپنی موت کو پکارو گے وقت ضائع نہ کرو جلدی بتاؤ کس کے مویشی ہیں یہ اور کدھر جا رہے ہیں۔

اس نے اٹک اٹک کر جواب دیا۔

مرالہ کے چودھری منظور اور مقبول کے ہیں۔

منظور کو تو ہم جانتے ہیں یہ مقبول کون ہے۔

اس کا چھوٹا بھائی ہے۔

انہوں نے اتنے مویشی کہاں سے لیے ہیں۔ سچ سچ کہنا جھوٹ بولا تو وقت سے پہلے ہی موت کی بغل میں چلے جاؤ گے۔

چوری کے ہیں۔

میرا بھی یہی خیال تھا۔ وہ دونوں بھائی تم لوگوں سے چوری کراتے ہوں گے۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

سلیم نے غصّے میں پوچھا۔

کیوں کرتے ہو تم لوگ چوری۔

وہ خاموش رہا۔

سلیم نے اُسے ریوالور کی ٹھوکر کرائی۔

شرم اور غیرت تو نہیں آتی تمہیں حرام کھاتے ہوئے۔ تم لوگ رات کی تاریکی میں ان رائفلوں کے بل بوتے پر غریب لوگوں سے ان کے مال مویشی چھین لیتے ہو۔ شرم کرو۔ کچھ غیرت کھاؤ۔ تمہیں پتہ ہے منظور کہاں ہے اس وقت۔

دونوں بھائی میلے پر گئے ہوئے ہیں۔

اس وہم میں نہ رہنا کہ وہ زندہ ہے۔ ہم نے اسے میلے سے اغوا کر کے اس ساتھ والے جنگل میں لا کر قتل کر دیا ہے۔ یقین نہ ہو تو یہ دیکھ لو ــــ سلیم نے اس کے سامنے اپنا خون آلود ٹوکا کر دیا۔

اسی ٹوکے سے ہم نے اس پاپی کی گردن کاٹی ہے۔ اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے اپنے گاؤں کی بوڑھی زینب کی بیٹی کو اغوا کر کے اس کی عزت لوٹی تھی۔

نواب نے اپنا گھوڑا آگے بڑھا دیا۔

تم اس کو سنبھالو سلیم! اور مَیں اس دوسرے کو لیتا ہوں۔ جب مَیں گولی چلاؤں تم بھی اسے ختم کر دینا پھر ہم باقی چاروں سے مل کر نمٹ لیں گے۔

نواب گھوڑا دوڑاتا ہوا دوسرے بدمعاش کے نزدیک گیا اور بڑی ہی عاجزی اور نرمی کے ساتھ اس نے پوچھا۔

اے بھائی! کدھر لے جا رہے ہو یہ مویشی۔

نواب پر نظر پڑتے ہی وہ فوراً اپنا ہاتھ رائفل پر لے گیا۔ مگر اس وقت نواب گولی چلا چکا تھا جو اس کا سینہ چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔

اسی لمحہ سلیم کی طرف سے بھی گولی چلنے کی آواز سنائی دی اور پہلے والا بدمعاش گھوڑے سے نیچے گرنے کے بعد تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا باقی چاروں بدمعاش فائرنگ کرتے ہوئے ان پر ٹوٹ پڑے تھے۔

سلیم اور نواب اکٹھے ہو گئے۔ انہوں نے اپنے جسم زین سے لگی ہوئی بلٹ پروف پلیٹوں کے پیچھے چھپا رکھے تھے۔ لہٰذا وہ ان کی گولیوں سے کافی حد تک محفوظ تھے۔

گولیوں کی آواز سے مویشیوں کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ انہوں نے دُم پیٹھ پر رکھ لی اور جدھر منہ اُٹھا بھاگ کھڑے ہوئے سلیم اور نواب نے زیادہ دیر نہ لگائی اور ان چاروں کو گولیوں کی سخت بوچھاڑ سے چھلنی کر دیا۔

اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ جلدی جلدی انہوں نے مویشی اکٹھے کیے اور طرح طرح کی آوازیں نکال نکال کر انہیں ہانکتے ہوئے وہ بستی میں لائے۔

بستی کے سارے لوگ ان کو اس قدر مویشیوں کے ساتھ دیکھ کر باہر نکل آئے تھے۔ سلیم رشید کے پاس آیا اور مویشیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

یہ سارے مویشی ہم نے مرالہ کے بدمعاش منظور اور مقبول کے

آدمیوں سے چھینے ہیں۔ یہ سب چوری کے ہیں اور وہ شاید انہیں بیچنے کے لیے منڈی لے جا رہے تھے۔ یہ سب نزدیک گاؤں کے ہی ہوں گے تم انہیں ان کے اصل مالکوں تک پہنچا دو۔

اب تو صبح ہی پہنچاؤں گا۔

ہاں ہاں صبح ہی۔ ان سب کو ایک جگہ جمع کر ان پر تین چار جوانوں کا پہرہ لگا دو تاکہ ان میں سے کوئی بھاگنے نہ پائے۔

رشید نے اِرد گرد کھڑے چند جوانوں کو اشارہ کیا اور وہ مویشیوں کو سنبھالنے لگے۔

سلیم اور نواب گھوڑوں سے اُتر گئے۔ اعظم نے آگے بڑھ کر اُن کے گھوڑوں کی باگیں پکڑ لیں اور خود وہ دونوں تہ خانے کی طرف جانے لگے تو رشید ان کے سامنے آتا ہوا بولا۔

بلقیس اور کشور بہن آئی تھیں۔

سلیم نے پریشانی سے پوچھا۔

کیوں خیریت تو تھی۔

خیریت ہی تھی ملنے آئی تھیں آپ سے۔

پھر۔

میں نے کہہ دیا تھا کہ شہر کی طرف گئے ہیں۔

کوئی پیغام تو نہیں دیا۔

نہیں ——— تھوڑی دیر بیٹھ کر چلی گئی تھیں۔ میں نے

اُنہیں کھانا وغیرہ کھلایا تھا۔

سلیم کے جواب دینے سے قبل نواب بولا۔

ہم بھی آج کھانا اِدھر ہی بیٹھ کر نہ کھالیں سلیم!

جیسے تمہاری مرضی۔

اداس لہجے میں سلیم نے جواب دیا۔

تو پھر آؤ بیٹھو مجھے تو بھوک لگی ہے۔ جاؤ رشید کھانا لے آؤ۔ یہیں بیٹھ کر ہم کھا لیتے ہیں۔

رشید نے ان دونوں کے ہاتھ پکڑ لیے۔

اندر آجائیں نا۔

رشید کے ساتھ وہ دونوں اندر آگئے اور کھانا کھانے لگے۔



(۲۶)

وہ دونوں اپنے تہ خانے میں بیٹھے تھے۔ بالکل اداس اور افسردہ افسردہ سے دونوں چٹائی پر بیٹھے تھے اور دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی سامنے والی دیوار پر جس قدر نام لکھے تھے ان سب پر لکیر پھری ہوئی تھی۔ سلیم کی بھاری اور گھمبیر سی آواز تہ خانے میں اُبھری۔

ہمارا مشن پورا ہو گیا نواب!

نواب نے آہستہ آہستہ گردن گھمائی اور اس کی طرف دیکھا۔

اس کی آنکھیں بوجھل تھیں۔

ہاں! مشن تو پورا ہو گیا۔

پھر!

اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیتے ہیں۔

میرا بھی یہی ارادہ ہے۔ جو کچھ ہم نے کرنا تھا سو ہم کر چکے اب فضول اور بے گناہ کسی کو قتل کرنا اپنی عاقبت خراب کرنا ہے بہتر ہے ہم آج ہی تھانے حاضر ہو جائیں۔

نواب کی آواز بھی ڈوبتی جا رہی تھی۔

میرا تمہارا موت تک کا ساتھ ہے۔ تمہارا فیصلہ میرا ہی فیصلہ

چلو اُٹھو پھر چلیں۔

چلو ——

دونو اُٹھ کر تہ خانے سے باہر آئے۔ سرما کی مدھم مدھم اور زرد زرد سی دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی حدِ نگاہ تک سرسوں کے پیلے پیلے پھول دکھائی دیتے تھے۔ مرد اور عورتیں مِل کر کھیتوں میں کام کر رہے تھے

ایک رونق تھی ہر سو۔

ایک بہار تھی ہر سمت۔

بھٹے کے اُوپر کھڑے ہو کر سلیم نے اپنے سامنے کھیتوں میں کام کرنے والے مرد عورتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

کبھی ہم بھی ان کی طرح کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ محنت کرتے تھے۔ ایک پُر امن اور آزاد شہری تھے مگر ان ظالم لوگوں نے ہمیں سکون سے جینے نہ دیا۔ اس نے سر جُھکا لیا اور آگے چل پڑا۔

خیر جو خدا کو منظور۔ یہی کچھ تھا ہماری قسمت میں۔ وہ سر جُھکائے آگے آگے چلتا رہا۔ نواب پیچھے پیچھے تھا اور اپنی آستین سے اپنی بھیگی ہوئی پلکوں میں آنسو بھی خشک کرتا جا رہا تھا۔

بستی سے اپنے گھوڑے لے کر سب سے پہلے وہ چاندی کوٹ میں آئے۔ شاید بلقیس کو اپنے ارادے سے آگاہ کرنا چاہتے تھے۔ گاؤں میں وہ داخل ہوئے ہی تھے کہ ان پر گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔

وہ اپنے گھوڑے گلیوں میں دوڑانے لگے۔ تعاقب کرنیوالے بھی ان کے پیچھے پیچھے ہی تھے اور اندھا دھند گولیاں برسا رہے تھے۔ سامنے گلی بند تھی وہ فوراً بائیں طرف مُڑے اور جان بچانے کی خاطر مسجد میں گُھس گئے۔ ان کے ہتھیار بھی ان کے پاس تھے۔

سلیم جب مسجد کے صحن میں داخل ہو رہا تھا تو تعاقب کرنے والوں میں سے کسی نے نشانہ لے کر اس پر گولی چلانا چاہی۔ نواب فوراً سامنے آ گیا اور گولی اس کا سینہ چیرتی ہوئی نکل گئی۔ اس نے اپنے منہ میں کپڑا ٹھونس لیا تھا تاکہ درد کی شدت کے باعث مُنہ سے چیخ نہ نکل جائے اور سلیم اسے سنبھالنے کے لیے کہیں رُک نہ جائے۔

سلیم بھاگتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا بچنے کی کوئی صورت نظر نہ آ رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید نواب اس کے پیچھے پیچھے ہی ہے مگر وہ بچارہ تو باہر خون میں لت پت تڑپ رہا تھا۔

مسجد کی الماری کے ایک خانے کو سلیم نے زور سے پیچھے دھکیلا وہاں سے اینٹیں گر گئیں اور اتنا سوراخ پیدا ہو گیا کہ انسان اس میں سے گزر جائے ۔ وہ سوراخ پار کر گیا ۔ مسجد میں اس نے اِدھر اُدھر دیکھا نواب نہیں تھا ۔ اس نے ہلکے سے آواز دی ۔

اِدھر آجاؤ نواب !

مگر اس کی آواز مسجد میں گونج کر رہ گئی ۔

اس نے پھر پکارا ۔

نواب ! نواب !

پر نواب ہوتا تو جواب ملتا نا ۔

باہر مسجد کے صحن میں کھٹکا ہوا اور اس نے سوراخ سے ہاتھ نکال کر الماری بند کر دی ۔

وہ اب ایک اندھیرے کمرے میں کھڑا ۔ یہ مسجد سے ملحق کسی کا مکان تھا ۔ اس کمرے سے نکل کر وہ ایک دوسرے کمرے میں آیا ۔ وہ پہلے کی نسبت کافی روشن تھا ۔ وہاں ایک بوڑھا ، چند عورتیں اور کچھ بچے فائرنگ سے دبکے بیٹھے تھے ۔

سلیم کو دیکھتے ہوئے بوڑھے نے کہا ۔

تم یہاں بیٹے ! کس طرف سے آئے ہو ؟ وہ شاید سلیم کو جانتا تھا ۔

سلیم ان کے پاس آ کھڑا ہوا ۔

میں یہ مسجد کی الماری میں سے سوراخ کر کے نکلا ہوں ۔

اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا ۔

تمہاری جان خطرے میں ہے ۔ چھت پر چڑھ جاؤ ۔ وہ تمہیں تلاش کرنے ضرور اِدھر آئیں گے ۔

سلیم نے بڑے مطمئن انداز میں پوچھا ۔

یہ ہیں کون ؟

مرالہ کا مقبول اور اس کے ساتھی ہیں ۔ یہ برکت کا چھوٹا بھائی ہے جسے تم نے قتل کیا تھا ۔

سلیم مکان کی چھت پر چڑھ گیا ۔ جنگلے میں سے جھانکتے ہوئے اس نے دیکھا مسجد کے عین سامنے ان کے دونوں گھوڑے کھڑے تھے ۔ مسجد کے باہر ابھی تک وہ یوں ہی ہوا میں اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے ۔

سلیم نے چھت کے اوپر سے مسجد کے صحن میں جھانکا ۔ نواب وہاں نہیں تھا مسجد سے ملحق پنچایت گھر کی طرف بھی اس نے نظر دوڑائی ۔ مگر نواب اسے کہیں بھی دکھائی نہ دیا ۔

وہ پھر اس مکان کے بالکل نیچے گلی میں دیکھنے لگا ۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا ۔ گلی بالکل سنسان پڑی تھی ۔ لوگ ڈر کے مارے اپنے گھروں میں دبک گئے تھے ۔

اچانک اس کی نظر جب مسجد کی طرف سے آنے والی گلی کی طرف اُٹھی تو اس نے دیکھا وہ سب اس مکان کے ساتھ سے گزرنے والی گلی کی طرف آ رہے تھے ۔ آگے آگے مقبول تھا اور پیچھے اس کے آٹھ ساتھی تھے ۔

سلیم اور نواب کے گھوڑے بھی انہوں نے پکڑ رکھے تھے۔

سلیم نے یہ بھی دیکھا کہ ایک گھوڑے پر لاش رکھی ہوئی ہے۔ وہ پریشان ہو گیا۔ آنکھیں ملتے ہوئے اس نے دوبارہ دیکھا۔

وہ نواب کی لاش تھی۔ اس کے سارے کپڑے خون سے تر تھے اور لاش سے خون نکل نکل کر گھوڑے کی پیٹھ کو تر کرتا ہوا ابھی بھی زمین پر گر رہا تھا۔

سلیم کا ذہن منتشر ہو گیا۔ حواس منجمد ہو کر رہ گئے۔ نواب اس کا دوست، اس کا بھائی، اس کا غم گسار مارا گیا تھا۔ اس پر جمود سا طاری ہو گیا تھا۔

فوراً ہی وہ سنبھل گیا۔ جنگلے کے سوراخ میں سے اس نے اپنی رائفل کا بیرل نکالا اور اندھا دھند ان پر گولیاں برسانے لگا۔ چار آدمی وہیں ڈھیر ہو گئے باقی بھاگ نکلے۔

سلیم نعرے مارتا ہوا اور شور کرتا ہوا چھت سے چھلانگ لگا کر مسجد کی دیوار پر آیا اور دیوار پر تھوڑی دور بھاگنے کے بعد اس نے پھر ان پر گولیاں برسائیں۔ دو اور آدمی اس نے ختم کر دیئے تھے۔ مقبول اور اس کا ایک ساتھی بھاگ گئے تھے۔ سلیم دیوار سے نیچے کودا۔ جس گھوڑے پر نواب کی لاش تھی۔ وہ اس پر سوار ہوا۔ لاش کو اپنے آگے اس نے اچھی طرح سنبھال لیا اور اس کے تعاقب میں نکل کھڑا ہوا۔

گاؤں سے باہر آ کر اس نے گھوڑے کو پوری رفتار پر چھوڑ دیا۔

پانچ منٹ کی کشمکش کے بعد ایک بار پھر وہ اُسے دکھائی دیئے۔

اس وقت وہ نالہ عبور کر رہے تھے۔ اس نے گھوڑے کو ایڑیاں مار مار کر نالہ عبور کیا۔ پھر شست لی اور تاک کر گولی ماری۔ مقبول کا ساتھی ڈھیر ہو کر گھوڑے سے نیچے گر گیا۔

مقبول راستے کے کنارے کھیتوں میں روپوش ہو گیا۔ سلیم نے اسے کافی تلاش کیا مگر کامیاب نہ ہوا۔ ناچار اور مجبور ہو کر اسے بستی کا رُخ کرنا پڑا۔



(۲۷)

ته خانے میں آج سلیم اکیلا ہی تھا۔ اس کی آنکھیں نم آلود، سرخ اور سوجی ہوئی تھیں۔ عجیب حالت تھی اس کی۔ ته خانے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک وہ اس طرح چکر لگا رہا تھا جیسے جنگل سے کسی شیر کو پکڑ کر پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو۔

چلتے چلتے وہ رُک گیا اور سامنے دیوار کی طرف دیکھا۔ سارے نام کٹے ہوئے تھے۔ اس نے کوئلہ اُٹھایا اور سب سے نیچے مقبول کا نام لکھ دیا۔

ته خانے سے وہ باہر آیا۔ خوب اندھیرا ہو گیا ہوا تھا۔ باہر رشید

اور اعظم اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے پاس آ کر وہ کافی دیر تک سر جھکائے کھڑا رہا۔

رشید اور اعظم اس کی یہ حالت دیکھ کر خون کے آنسو رو رہے تھے قریب ہی دونوں گھوڑے کھڑے تھے۔

مدھم سی آواز میں سلیم نے رشید سے پوچھا۔

یہ دوسرا گھوڑا کیسے آیا۔

اس نے اپنی آنکھیں خشک کیں۔

آپ ہی آپ آ گیا ہے۔

سلیم اپنے گھوڑے کے پاس آیا اور اس کی گردن تھپتھپانے لگا۔ پھر وہ اس پر سوار ہو گیا۔

ہم بھی ساتھ چلیں گے دوست!

سلیم کا سر پھر جھکا ہوا تھا۔

نہیں میں اکیلا ہی جاؤں گا۔ یہ میرا آخری داؤ ہے اور میری زندگی موت کا داؤ ہے۔ تم دونوں کے لیے میری ایک نصیحت ہے۔

رشید اس کے قریب آیا۔

کہو ——— !

میں اگر اس مہم میں کام آ گیا تو میری لاش نواب کے پہلو میں دبا دینا۔

رشید کچھ کہنا چاہتا تھا مگر سلیم اپنے گھوڑے کی باگیں موڑ کر

اسے ایڑ لگا چکا تھا۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اندھیرے میں روپوش ہوگیا۔

اندھیرے کو چیرتا ہُوا وہ قبرستان میں داخل ہُوا اور نواب کی قبر کے پاس آ رکا۔ قبر کے پاؤں کی طرف چار فٹ ایک گہرا گڑھا بھی کھودا گیا ہُوا تھا۔ اس کے کنارے آ کر سلیم گھوڑے سے اُترا۔ قبر پر فاتحہ کہی پیچھے ہٹتے ہوئے اس نے زہریلے مگر زخمی لہجے میں کہا "تمہارے خون کی قسم نواب زندگی نے وفا کی تو مَیں مقبول کی قربانی تمہاری قبر پر پیش کر دوں گا۔ اس کے خون سے مَیں تمہاری قبر بھگو دوں گا۔ پھر وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور اندھیرے کا سینہ چیرنے لگا۔

مقبول کے گاؤں مرالہ سے باہر وہ گھوڑے سے اُتر گیا اور گنے کے ایک کھیت میں داخل ہوگیا۔ وہاں شیشم کا ایک درخت تھا سلیم نے گھوڑا اس سے باندھ دیا۔

اپنی رائفل، ریوالور اور ٹوکہ اس نے لیا اور گاؤں میں داخل ہوا۔ مقبول کی حویلی کے پاس آ کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر دیوار پھلانگ کر اندر چلا گیا۔ اس نے سامنے والے کمرے کا دروازہ دبایا۔ وہ اندر سے بند تھا۔ سردی کے باعث سب اندر سوئے ہوئے تھے۔

وہ دائیں طرف ایک کمرے کی طرف گیا۔ اسے باہر سے تالا پڑا ہُوا تھا اور اندر مویشی بندھے ہوئے تھے کیونکہ ان کی سانسیں باہر آسانی سے سُنی جاسکتی تھیں۔

سلیم نے وہاں کھڑے ہو کر کچھ سوچا پھر وہ اس کمرے کی پُشت پر آیا اور اپنے ٹوکے کی مدد سے دیوار کے اندر وہ سوراخ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

وہ اس کمرے میں گھُسا اور ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ پُوری رات اسے وہیں گزارنا پڑی۔ صبح ابھی طلوع نہ ہوئی تھی کہ کسی نے اس کمرے کا دروازہ کھولا۔ باہر چاند کی چاندنی تھی۔ سلیم نے پہچان لیا وہ مقبول ہی تھا۔

جونہی مقبول اندر داخل ہُوا سلیم نے اپنا ایک ہاتھ اس کے مُنہ پر رکھ دیا۔ ساتھ ہی ریوالور کی نالی اس کی پسلی میں چبھوئی۔ شور کرنے کی کوشش کی تو گولیوں سے چھید کر رکھ دوں گا۔ اس کے مُنہ پر ہاتھ رکھے وہ اسے باہر لایا اور صحن کا دروازہ کھولنے کو کہا۔

مقبول نے کانپتے ہاتھوں سے زنجیر کھول دی۔ سلیم اسی حالت میں اسے کماد کے کھیت میں لایا اور گھوڑے پر بٹھا لیا۔ خود بھی وہ اس کے پیچھے بیٹھا اور گھوڑے کو نواب کی قبر کی سمت بڑی تیزی سے دوڑانے لگا۔

نواب کی قبر کے پاس آ کر وہ اُترا۔ مقبول کو بھی نیچے اتارا۔ مقبول زمین پر کھڑا کانپ رہا تھا۔ فضا میں سلیم کی کرخت آواز گونجی۔

یہ نواب کی قبر ہے اس پر چت لیٹ جاؤ۔

مقبول ہچکچایا۔

سلیم نے ٹوکہ لہرایا اور ساتھ ہی اس کے پیٹ پر گھٹنے کی ایک سخت ضرب لگائی۔

لیٹ جاؤ میں کہتا ہوں۔

مقبول لیٹ گیا۔

سلیم نے ٹوکہ اُٹھایا اور اس کی گردن کاٹ دی۔ اس کا سر لڑھکتا ہوا قبر سے نیچے گر گیا۔

سلیم نے ٹوکہ پھر بلند کیا اور جسم کو پیٹ میں سے کاٹ کر دو حصّوں میں تقسیم کر دیا۔ خون ٹپکتا ہوا ٹوکہ ہاتھ میں پکڑے کافی دیر تک وہ پاگلوں اور وحشیوں کی طرح قہقہے لگاتا رہا۔ مقبول کے خون سے نواب کی قبر تر ہو گئی ہوئی تھی۔

لاش کے تینوں ٹکڑے اٹھا کر سلیم نے گڑھے میں پھینک دیئے اور اوپر مٹی بھر دی۔ اس کے اپنے کپڑے بھی بُری طرح خون میں بھیگ گئے تھے۔

وہاں سے فارغ ہو کر وہ پھر تہ خانے میں آیا اور کوئلہ اُٹھا کر مقبول کے نام پر لکیر پھیر دی۔ پھر وہ بائیں جانب والی دیوار کے قریب آیا اور اس پر لکھا۔

"آنے والی نسلوں کے نام"

اس کے نیچے اس نے لکیر کھینچی اور پھر لکھا۔

"قانون کے ہاتھ دراز ہیں مگر دولت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ انصاف کے پاس ترازو ہے مگر کوئی اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا"

تہ خانے میں جلتی ہوئی شمع اس نے گُل کر دی اور باہر آگیا۔ گھوڑے پر وہ پھر سوار ہو گیا۔ فضاؤں میں ابھی گہرا اندھیرا ہی تھا۔

وہ سیدھا اپنے گھر داخل ہوا۔ گلشن نے دروازہ کھولا۔ اس سے کوئی بات کیے بغیر وہ صحن کے وسط میں آ کھڑا ہوا۔ گلشن اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

خیریت ہے نا بیٹے!

سلیم کا سر جھک گیا اور دھیمی سی مگر لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں اس نے کہا۔

میں آج اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر رہا ہوں ماں! اس زندگی سے میں تھک گیا ہوں۔ میں نے اپنے ہر دشمن سے انتقام لے لیا ہے۔ اب یہ زندگی بے مقصد ہے۔ میری ایک التجا ہے ماں! تم آج ہی جا کر بلقیس کو چاندی کورٹ سے لے آنا اور اسے اپنی بیٹی کی طرح رکھنا۔ نادر اور مُراد کی پرورش ایسے ہی کرنا جس طرح میری اور نصیر کی کی تھی۔ میرے مقدمے کی پیروی نہ کرنا ماں!

گلشن اس سے لپٹ گئی اور اُونچی آواز سے رونے لگی۔

میرے بچے! میرے لال!

سلیم کی ڈوبتی ہوئی آواز پھر اُبھری۔

میرے پاس وقت نہیں ہے ماں! مجھے اجازت دو کہ میں کشور سے مل لوں۔ اس سے قبل کہ سورج طلوع ہو جائے اور میرا کوئی دشمن مجھے تمہارے سامنے ہی قتل کر دے، میں قانون کی گرفت میں چلا جانا چاہتا ہوں۔

گلشن اندر چلی گئی۔

میں کشور کو لاتی ہوں مگر وہ اکیلی ہی آ گئی اور سلیم سے کہا۔

کشور جاگ رہی ہے بیٹے! اور ہماری ساری باتیں سن چکی ہے جاؤ اندر جا کر اسے مل لو۔

سلیم اندر گیا۔ کمرے کی دیوار سے ٹیک لگائے کشور کھڑی تھی اور آنکھیں بند کیے رو رہی تھی۔ سلیم اس کے سامنے کھڑا ہو گیا اور سر جھکاتے ہوئے ہلکے سے پکارا۔

کشور!

کشور نے آنکھیں کھولیں اور بری طرح سے اس سے لپٹتے ہوئے اونچی آواز میں رونے لگی۔ باہر گلشن بھی رو رہی تھی۔ سلیم کا اس ماحول میں دل پھٹا جا رہا تھا۔ کشور سے وہ علیحدہ ہوا اور گھوڑے کی باگ پکڑے باہر نکل گیا۔ گلشن اور کشور گلی میں آ کر اسے اس وقت تک دیکھتی رہیں۔ جب تک وہ دکھائی دیتا رہا پھر وہ روتی ہوئی اندر چلی گئیں۔

سلیم کو پھانسی کی سزا ہو گئی تھی۔ جس روز اسے پھانسی ہونا تھی منشی امین اور ماسٹر حنیف اس کی لاش لینے گئے تھے۔ ان کے ساتھ گلشن

کشور، بلقیس، نادر اور مراد بھی گئے تھے۔

سلیم کو جب اوپر لایا گیا اور اس کی نظر اپنی ماں پہ پڑی تو اس نے ہاتھ ہوا میں لہرا کر اونچی آواز میں کہا۔

ماں! خدا کے بعد تم ہی ایک ایسی ہستی ہو جسے پوجا جا سکتا ہے تم گواہ رہنا ماں! یہاں بھی اور حشر میں بھی کہ میں قاتل نہ تھا۔ میں چور، ڈاکو اور لٹیرا نہ تھا۔ میں مجرم نہ تھا۔ ان کھوکھلی عدالتوں نے مجھے یہ راہ دکھائی اس انصاف نے جو اندھا ہے مجھے ان تاریکیوں میں دھکیل دیا۔

ماں! یہاں قانون کا سودا ہوتا ہے۔ انصاف بکتا ہے۔

ان چودھریوں نے، ان جاگیرداروں نے، ان وڈیروں نے مجھے خونی اور قاتل بننے پر مجبور کیا۔ معاشرے کا یہ سیاہ چہرے والا طبقہ غریبوں کے سارے جرائم کی پیداوار کا محرک اور ذمہ دار ہے۔ تم صبر کرنا ماں! میری لاش پہ رونا نا۔ ہم غریب کسانوں کی منزل ابھی دور ہے جہاں پہنچ کر ہمیں جاگیرداروں کے مظالم سے چھٹکارا ملے گا۔

مرنے کے بعد بھی میں زندہ رہوں گا ماں! میرے بعد میرے جیسے کئی غریب کسان جاگیرداروں کے مظالم کے خلاف بغاوت کے علم بلند کریں گے اور اپنی اس منزل کو جو دھندلی اور دور ہے ضرور پا کر رہیں گے۔

سلیم کو پھانسی ہو گئی۔ امین اور حنیف جا کر اس کی لاش لے آئے۔ گلشن، بلقیس، نادر اور مراد لاش سے لپٹ لپٹ کر رونے لگے۔

کشور ابھی تک ایک ستون کا سہارا لیے کھڑی تھی۔ بالکل چُپ چُپ، اداس اور افسردہ جیسے پتھر کا کوئی بُت ہو۔

حنیف نے آگے بڑھ کر اس کا شانہ ہلایا۔

بیٹی! وہ ——

الفاظ حنیف کے منہ میں ہی رہ گئے۔ کشور لکڑی کی طرح زمین پر گر گئی تھی۔ حنیف نے اس کی نبض دیکھی اور رو دیا۔ وہ بچاری پتہ نہیں کس وقت کی مر چکی تھی۔

امین اور حنیف، ایک لاش لینے آئے تھے اور بچارے دو لاشیں اُٹھا کر روتے دھوتے بین کرتی ہوئی گلشن اور بلقیس چیختے چلّاتے مراد اور نادر کے ساتھ گھر چلے گئے۔



تمت بالخیر